ندائے خلافت کے تین خصوصی شمارے

(۱) سقوط مشرقی پاکستان نمبر

☆ پاکستان کیسے ٹوٹا؟ پاکستان توڑنے کا ذمہ دار کون؟

☆ 7 دسمبر 1970ء سے 16 دسمبر 1971ء تک سانحہ مشرقی پاکستان کی تاریخ وار روداد

☆ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے سامنے گورنر ایڈمرل ایس ایم احسن کا بیان

☆ مجیب الرحمٰن کے قتل کی کہانی —— حسینہ واجد کی زبانی

یہ سب ندائے خلافت کے ''سقوط مشرقی پاکستان نمبر'' میں پڑھیے:

صفحات 68..... قیمت 20 روپے

☆☆☆

(۲) فلسطین نمبر

☆ تنازعہ فلسطین کا تاریخی پس منظر

☆ موجودہ سنگین صورت حال.....اور فلسطین کا مستقبل جیسے موضوعات پر مشتمل ایک دستاویز

96 صفحات..... قیمت: 35 روپے

☆☆☆

(۳) پیام اقبال بنام نوجوانان ملت

☆ سال اقبال کے حوالے سے علامہ اقبال کے حضور ہدیہ عقیدت

☆ اقبال کا انقلابی و آفاقی پیغام جس میں موجودہ حالات کے حوالے سے امت مسلمہ، مسلمانانِ پاکستان اور بالخصوص نوجوانوں کیلئے دعوت فکر و عمل ہے، پیام اقبال کا موضوع ہے

صفحات: 86..... قیمت 50 روپے

ملنے کا پتہ: **مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور**

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 03-5869501

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

المطالعہ
17 FEB

ماھنامہ

حکمتِ قرآن

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم
مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی
معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)
ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۲۲ | ذوالحجہ ۱۴۲۳ھ - فروری ۲۰۰۳ء | شمارہ ۲

— یکے از مطبوعات —
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱
کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بجری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۹۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے، فی شمارہ: 10 روپے
☆ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 700 روپے ☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 900 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

حرفِ اوّل

امتِ مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے سائے گہرے ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ میں شامل عرب ممالک خوفناک تباہی کے دہانے تک پہنچ چکے ہیں۔ پاکستان کی سرزمین پر ایف بی آئی کی عملداری قومی غیرت وحمیت کے منہ پر طمانچوں کی طرح برس رہی ہے۔ ''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی'' کا اعتراف اقتدار کے اعلیٰ ترین ایوان سے ان الفاظ میں برملا کیا جانے لگا ہے کہ ''کوشش کریں گے کہ عراق کے بعد پاکستان کی باری نہ آئے''۔ لیکن زندہ دلانِ لاہور کی ''زندہ دلی'' ملاحظہ ہو کہ وہ ان مہیب اور حوصلہ شکن حالات میں بھی ''بسنت کا جشن'' پچھلے سالوں کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کر ایک دن کے بجائے مسلسل تین دن تک منانے کا عزم وارادہ رکھتے ہیں اور جشن بھی اس انداز کا کہ رب العالمین کے جوشِ غضب سے دھرتی تھرتھرانے اور آسمان کپکپانے لگیں۔ ع حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!!

قرآن حکیم کی ابدی ہدایت کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ صورتِ حال ایک نہایت عبرتناک انجام کی تمہید ہے ـــــ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر **16** میں صاف فرما دیا گیا کہ:

> ''جب ہم کسی بستی کو (اس کے مکینوں سمیت) ہلاک و برباد کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اس (بستی) کے خوشحال طبقے کو حکم دیتے (کھلی چھٹی دے دیتے) ہیں اور وہ اس بستی میں گناہوں اور نافرمانیوں کا بازار گرم کر دیتے ہیں' تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اس بستی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔''

مملکت خداداد پاکستان میں اسلامی تعلیمات' اسلامی اقدار اور احکام شریعت کی دھجیاں جس طرح سرکاری سطح پر پوری ڈھٹائی کے ساتھ شہر لاہور میں بسنت کے موقع پر بکھیری جاتی ہیں وہ بلاشبہ عذابِ الٰہی کو دعوت دینے سے کم نہیں!

عیدالاضحیٰ، قربانی اور فلسفۂ حیات

ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کے ایک جامع خطاب کا ابتدائی حصہ

خطبۂ مسنونہ، متعلقہ آیاتِ قرآنی، کی تلاوت اور ادعیہ ماثورہ کے بعد:

عیدالاضحیٰ کی نمایاں ترین اور امتیازی شان قربانی ہے۔ اس قربانی کا فلسفہ کیا ہے! یہ کس چیز کی علامت ہے! یہ وہ بات ہے جو خود صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے نبی اکرم ﷺ سے دریافت کی تھی۔ اس لئے کہ قرآن مجید نے صحابہ کرام ؓ میں یہ روح بیدار کر دی تھی کہ وہ احکامِ ربانی کی علتیں، مصلحتیں اور حکمتیں جاننے کی کوشش کریں۔ قرآن مجید کا عمومی انداز یہی ہے کہ وہ جو حکم دیتا ہے اس کی عِلّت و حکمت بھی بیان کر دیتا ہے۔ چنانچہ نماز کی حکمت یوں بیان کی گئی ہے کہ:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ﴾

''نماز قائم کرو میری یاد کے لئے''۔

یہ صرف ایک رسم (ritual) نہیں ہے، اس کا ایک معیّن مقصد ہے ـــــ روزہ رکھنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی اس کی حکمت بھی بتا دی کہ:

﴿لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ﴾

''تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے''۔

لہٰذا واضح کر دیا گیا کہ روزے کی یہ عبادت بھی محض ایک رسم نہیں ہے، بلکہ اس کا بھی ایک معیّن مقصد ہے اور اس کی بھی ایک حکمت ہے۔ لہٰذا قربانی کی حکمت معلوم کرنے کے لئے صحابہ کرام ؓ نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ:

مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِیُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!

اے اللہ کے رسولؐ ان قربانیوں کی کیا حقیقت ہے؟

دیکھئے اس سوال کے انداز میں بھی ایک بہت پیارا نکتہ پنہاں ہے۔ یعنی صحابہ کرام ؓ عرض کر رہے ہیں کہ قربانی تو ہم دیتے ہی ہیں' کیونکہ آپؐ نے اس کا حکم دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکم پر عمل کرنے کا دارومدار حکمت وعلّت اور مقصد کے جاننے اور سمجھ لینے پر نہیں ہے' حکم پر عمل تو اصلاً اس لئے ہوگا کہ وہ حکم اللہ یا اس کے رسول ﷺ کا ہے۔ البتہ اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ ہر حکم پر غور وتدبّر کیا جائے اور احکام کی عِلّتیں اور حکمتیں سمجھنے اور دریافت کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمارے ہاں فقہ میں اجتہاد اور قیاس کا جو معاملہ ہے اس کا دارومدار احکام کی عِلّت وحکمت کی دریافت پر ہی ہے۔ یہ اپنی جگہ خود ایک علیحدہ بحث ہے کہ کسی حکم کے بارے میں غور وتدبّر کرنا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنا کہ اس کا کیا سبب وعلّت ہے؟ اس کی کیا حکمت وغایت ہے اور اس کا کیا مقصد ہے؟ ہمارے دین نے اس کی حوصلہ شکنی کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اِسی سے ہمت پا کر صحابہ کرام ؓ نے سوال کیا کہ ہم جو آپؐ کے حکم پر عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی دیتے ہیں تو ہمیں یہ بتائیے کہ یہ ہے کیا؟ یعنی اس کی غرض وغایت کیا ہے؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ یہ کس چیز کے لئے بطورِ علامت ہے؟ تو نبی اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ:

((سُنَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ))

''یہ تمہارے باپ (حضرت) ابراہیم ؑ کی سنت ہے''۔

یہ اُس عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے کہ جس میں ایک سو سالہ بوڑھے باپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے اکلوتے بیٹے کے گلے پر جو نوجوانی کے دَور میں قدم رکھ رہا تھا' چھری پھیر دی تھی۔ جو گویا کہ اللہ کی راہ میں قربانی کی آخری صورت ہو سکتی ہے کہ اپنی محبت' اپنے جذبات اور احساسات کو اللہ کی رضاجوئی کے لئے قربان کر دیا جائے۔ یہ وہ واقعہ ہے جو اِس لحاظ سے نوعِ انسانی کی تاریخ کی ایک عظیم علامت (symbol) بن گیا ہے اور اس طرح یہ قربانی ہمیشہ کے لئے شعائرِ دین میں شامل ہو گئی ہے۔ یہ اس قربانی کی روح کو بیدار اور برقرار رکھنے کا بھی ایک اہم ذریعہ بن گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو

ایک بندۂ مؤمن سے مطلوب ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی محبوب ترین چیز بھی قربان کرنے کے لئے تیار رہو۔ چنانچہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کی یاد ہے جو ہر سال منائی جاتی ہے۔

اب میں چاہوں گا کہ آپ کو بتاؤں کہ اصل میں یہ قربانی حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی زندگی میں کس اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی قربانیوں کا وہ کون سا سلسلہ ہے جس کا آخری نقطۂ عروج (climax) یہ واقعہ ہے۔

حیاتِ دُنیوی کا جو فلسفہ قرآن بیان کرتا ہے' وہ سورۃ الملک آیت ۲ کے ذریعے بڑی جامعیت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتا ہے ـــــ میں نے یہاں خاص طور پر ''حیاتِ دُنیوی کا فلسفہ'' کے الفاظ ادا کئے ہیں۔ ہمارے دین کے نزدیک کل حیات یہ نہیں ہے' حیاتِ انسانی بہت طویل ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی!

لیکن یہ جو موت ہے اس کے ذریعہ سے حیاتِ انسانی کی طویل زندگی کا ایک انتہائی قلیل ٹکڑا کاٹ لیا گیا ہے۔ یہ جو ٹکڑا کٹ گیا ہے' یعنی موت سے پہلے کی زندگی' تو اس حصے کو انسان دنیا میں بسر کر رہا ہے۔ اب سوچنا یہ ہوگا کہ انسان کی اس دُنیوی زندگی کی غرض و غایت کیا ہے! فرمایا:

﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ﴾

''اُس ذات (یعنی اللہ تعالیٰ) نے موت و حیات کا یہ سلسلہ اس لئے تخلیق فرمایا کہ (اس کے ذریعے) تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے''۔

''ب ل و'' مادّہ عربی زبان میں ''پرکھنے'' کے لئے آتا ہے۔ اسی سے باب افتعال میں لفظ ''ابتلاء'' ہے اور اسی سے لفظ ''بلویٰ'' بنا ہے۔ اس ابتلاء کے ذریعے خوف کی حالت میں انسان کی ہمت' اس کے ثبات' اس کی عزیمت اور اس کے صبر کی آزمائش ہوتی ہے۔ یہ لفظ سورۃ الصافات کی ان آیات میں بھی آیا ہے جن میں حضرت ابراہیم

ﷺ کا حضرت اسماعیل ﷺ کی قربانی پیش کرنے کا تذکرہ ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ﴾

''(اے ابراہیمؑ) یقیناً یہ ایک بہت ہی کھلی (نمایاں' واضح اور کٹھن) آزمائش تھی''۔

پس معلوم ہوا کہ خالقِ کائنات کی طرف سے موت و حیات کا یہ نظام انسان کی ابتلاء' آزمائش' امتحان اور اسے جانچنے اور پرکھنے کے لئے تخلیق فرمایا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسی آیت میں اس جانچ پرکھ کی غایت بھی بیان کر دی گئی کہ ﴿اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ یعنی وہ (اللہ تعالیٰ) یہ دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔ تم اس دنیا میں اپنے خالق کی ذات سے محجوب کر دیئے گئے ہو اور اصل حقائق تمہاری نگاہوں سے اوجھل کر دیئے گئے ہیں۔ حقیقت الحقائق ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾۔ الحق اللہ کی ذات ہے اور وہ آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اب تمہاری آزمائش اور تمہارا امتحان اس میں ہے کہ ہم نے تم کو جو استعدادات دی ہیں' عقل' نظر اور تفکر و تدبر کی جو صلاحیتیں عطا کی ہیں' جو بصیرتِ باطنی عنایت کی ہے تو ایک تو ان کے ذریعے ہم کو پہچانو۔ اِن آنکھوں نے دیکھے بغیر دل کی آنکھوں سے ہمیں دیکھو اور ہماری معرفت حاصل کرو۔۔۔ پہلی آزمائش یہ ہے۔ یہ تو گویا نظری' فکری' عقلی اور علمی آزمائش ہے کہ آیا تم حجابات ہی سے محجوب ہو کر رہ جاتے ہو' پردوں ہی کے نقش و نگار دیکھنے میں محو ہو جاتے ہو' یہیں کی ظاہری آرائش و زیبائش تمہیں مبہوت کر دیتی ہے اور تم اسی کے اندر گم ہو کر رہ جاتے ہو یا اپنے ربّ کی معرفت حاصل کرتے ہو۔ ہم نے تمہیں پردوں میں رکھا ہے۔ پھر پردے بھی بڑے خوشنما ہیں۔ اس زمین میں جو کچھ ہے اس کو ہم نے اس کی زینت کے لئے بنایا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الکہف:۷)

''یہ جو کچھ بھی سروسامان زمین پر ہے' واقعہ یہ ہے کہ اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے''۔

چنانچہ اس میں بھی ایک آزمائش ہے' ابتلاء ہے' امتحان ہے۔ تو پہلی آزمائش عقل اور فکر و نظر کی آزمائش ہے۔ انسان کی جو قوتِ نظری ہے اس کا امتحان ہے کہ یہ انسان

اپنے ربّ' مالک اور خالق کو پہچانتا ہے یا نہیں ـــــ جبکہ دوسری آزمائش انسان کے ارادے' عمل اور سیرت و کردار کی پختگی سے متعلق ہے۔

﴿اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾

''تم میں سے خوب ترین عمل کون کرتا ہے''۔

اب اگر اپنے مالک و خالقِ حقیقی کو پہچان لیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ انسان اسی سے دل لگائے' اسی سے لَو لگائے' اسی کو مطلوب و مقصود بنائے' اسی کی عبادت و اطاعت کرے۔ اب قدم قدم پر امتحانات آئیں گے۔ دنیا کی چیزیں انسان کو اپنی طرف کھینچیں گی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اُس کو آزمائے گا کہ وہ ان آرائشوں اور زیبائشوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا ہماری طرف متوجہ ہوتا ہے' ان کو مطلوب و مقصود بناتا ہے یا ہمیں مطلوب و مقصود بناتا ہے۔ اگر اس کے سامنے یہ متبادل (alternative) راستے رکھ دیئے جائیں کہ یا اللہ کے راستے کو چھوڑ دو یا اپنے عزیزوں کو چھوڑ دو' وطن کو خیر باد کہہ دو' تو دیکھیں کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ وطن اور اپنے اعزہ کے حق میں فیصلہ کرتا ہے یا اللہ کے حق میں فیصلہ کرتا ہے! اگر اس کے سامنے یہ دوراہا آ جاتا ہے کہ یا والدین کو چھوڑے یا اللہ کی توحید کو چھوڑے' تو دیکھیں کس کو چھوڑتا ہے! اگر اس کے سامنے یہ معاملہ آ جائے کہ اپنی زندگی کی قربانی قبول کرے یا اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کا رشتہ توڑ دے اور معبودانِ باطل کی پرستش کرنے لگے' تو دیکھیں کہ اس کے بارے میں اس کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ ـــــ اور اگر اس کے سامنے یہ مرحلہ آ جائے کہ دنیا کی جو محبوب ترین شے ہو سکتی ہے اس کی محبت اور اللہ کی محبت کے درمیان فیصلہ کرنے کو کہا جائے تو دیکھیں کہ وہ کدھر کا رُخ کرتا ہے بقول شاعر ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!

یہ کُل امتحان ہے ـــــ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ پہلا امتحان عقل و فکر کا امتحان ہے' دوسرا امتحان ارادے' نیت' سیرت و کردار اور عمل کا امتحان ہے۔ تو یہ ہے امتحان اور یہ

ہے زندگی کی اصل غرض و غایت۔ ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ — اس کی ترجمانی بھی علامہ اقبال مرحوم نے بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

یہ جو ہماری زندگی ہے' حباب کی مانند[1] ہے۔ یعنی بڑی عارضی' بڑی فانی۔ بلبلہ اب پھٹا کہ اب پھٹا۔ بلبلے کی اس سے زیادہ اور کیا حیثیت ہے۔ اس حیاتِ دُنیوی کی پائیداری پر کوئی اعتماد نہیں ہوسکتا کہ یہ کب تک رہے گی۔ لیکن جتنی دیر بھی یہ بلبلہ قائم رہے' اس کی بھی ایک غرض و غایت ہے' وہ بھی عبث نہیں ہے۔ ذرا اِس کائنات کی وسعتوں کا تصور کیجئے' جس کو علامہ مرحوم نے اس شعر میں قلزم سے تعبیر کیا ہے۔ پس یہ زندگی ایک آزمائش اور امتحان سے زیادہ کوئی حیثیت اور وقعت نہیں رکھتی۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

اس امتحان کی جو کامل و مکمل مثال قرآن مجید پیش کرتا ہے' وہ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۴ کے ابتدائی حصہ میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾

''اور یاد کرو کہ جب آزمایا ابراہیم علیہ السلام کو اس کے ربّ نے بڑی بڑی باتوں میں' تو وہ ان سب میں پورا اتر گیا''۔

یہاں لفظ بِكَلِمٰتٍ میں تنوین تنکیر کے لئے آئی ہے۔ اس نے اس کو نکرہ بنا دیا ہے اور تنکیر عربی زبان میں تفخیم کے لئے' یعنی کسی چیز کی عظمت و شان کو بیان کرنے کے

(۱) بقول میر تقی میر۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے!

لئے آتی ہے۔ ''بِکَلِمٰتٍ'' میں بڑے بڑے اور کٹھن امتحانات کا مفہوم شامل ہو گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کے ربّ نے بڑے سخت اور مشکل امتحانات لئے لیکن اس اللہ کے بندے نے سب کو پورا کر دکھایا۔ اس کی قوتِ ارادی میں کہیں ضعف و تأمل اور تذلّل پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس کی عزیمت میں کمزوری اور تذبذب کے کہیں آثار ہویدا ہی نہیں ہوئے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ان امتحانات کو پاس کر گئے تو ان کو یہ بشارت دی گئی:

﴿قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ﴾

''(تو اللہ تعالیٰ نے) کہا (اے ابراہیمؑ) یقیناً میں تمہیں پوری نوعِ انسانی کا امام بنانے والا ہوں''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بر بنائے طبع بشری فوراً سوال کیا: ﴿وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ﴾ اے اللہ یہ وعدہ صرف مجھ سے ہے یا میری نسل سے بھی ہے؟ جواب ملا: ﴿قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝﴾ ''میرا یہ عہد ظالموں کے ساتھ نہیں ہوگا''۔ تمہاری نسل میں سے جو ظالم ہوں گے وہ اس وعدے کے مستحق نہیں ہوں گے۔ ''ظلم'' کے متعلق میں اکثر دروس میں ذکر کر چکا ہوں کہ قرآن کریم میں اکثر و بیشتر ''ظلم'' کے لفظ سے شرک مراد ہوتا ہے۔ تمہارا اصل کمال یہ ہے کہ تم نے توحید کی ترازو میں پورا اتر کر دکھایا۔ اس کی وجہ سے تم ''امام الناس'' کے مقام پر فائز کئے جا رہے ہو۔ اب اگر تمہاری نسل میں سے جو لوگ مشرک ہو جائیں گے تو وہ میرے اس عہد کے حق دار کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس مفہوم کو بھی علامہ اقبال مرحوم نے بڑے سادہ الفاظ میں ادا کیا ہے۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر لائقِ میراثِ پدر کیونکر ہو؟

معاملہ کسی اصول کے تحت ہوگا۔ محض نسل کے اعتبار سے ہو تو یہ انصاف، عدل اور قسط کے منافی ہوگا۔

مکرّراتُ القرآن

یعنی

قرآن مجید میں مکرّر آیتیں کیوں ہیں؟

(ایک قدیم مقالہ جو جنوری ۱۹۰۹ء میں ''الندوہ'' میں شائع ہوا تھا)

علامہ سید سلیمان ندویؒ

ایک دن نواب صدیق حسن خان کی تفسیر دیکھ رہا تھا کہ اس عبارت پر نظر پڑی:

وقد نبغت فی هذا القرآن طائفة تفسّر القرآن برأیها وتحذف منه الآیات المتوالیات تسمی بالنیفریة

''اس زمانہ میں ایک فرقہ پیدا ہوا ہے جو اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کرتا ہے اور مکرّر آیتوں کو قرآن سے خارج سمجھتا ہے۔ اس فرقہ کا نام نیفریہ (نیچری) ہے۔''

کیا ہندوستان میں کوئی ایسا فرقہ بھی ہے جو مکرّر آیتوں کو خارج از قرآن سمجھتا ہو؟

مخالفینِ اسلام کا قرآن مجید کے اسلوبِ بلاغت پر ایک اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک ہی قصہ مکرّر سہ کرّر بیان ہوتا ہے' ایک ہی آیت بار بار آتی ہے' ایک ہی بات سو سو دفعہ دہرائی جاتی ہے' اس بار بار کی تکرار سے کیا حاصل؟ اس سے کلام کا لطف جاتا رہتا ہے اور کلام بدمزہ ہو جاتا ہے' پوری کتاب میں ایک بات کو ایک دفعہ کہہ دینا کافی ہے' قرآن مجید میں حضرت آدمؑ' حضرت عیسیٰؑ' حضرت موسیٰؑ کے قصے ہر جگہ بیان کئے گئے ہیں' سورۂ رحمٰن میں ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ اور سورۃ المرسلات میں ﴿وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ﴾ ایک ایک آیت کے بعد ہے اور بعض جگہ بالکل بے جوڑ ہے۔

لیکن یہ اعتراض کوئی نیا اعتراض نہیں۔ علمائے اسلام نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں۔ علامہ کرمانی المتوفی ۷۸۶ھ نے ایک مستقل رسالہ اس باب میں لکھا ہے'

جس میں انہوں نے اپنا نظریہ یہ قرار دیا ہے کہ قرآن میں کوئی مکرّر بات نہیں، جہاں جہاں قرآنِ مجید میں بظاہر ایک ہی معنیٰ مکرّر معلوم ہوتے ہیں وہاں یہ ثابت کیا ہے کہ ہر جگہ مختلف معنیٰ مراد ہیں، اس لئے یہ اعتراض ہی غلط ہے کہ قرآنِ مجید میں ایک ہی بات بار بار آئی ہے۔

مثنوی میں مولانائے روم نے اس اعتراض کا ایک اور جواب دیا ہے، جو گو شاعرانہ استدلال ہے مگر نہایت لطیف ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم روزانہ دن رات ایک ہی کھانا کھاتے ہیں اور ایک ہی قسم کا پانی پیتے ہیں، لیکن ہم کو کبھی اس بات کی شکایت نہیں ہوتی کہ بار بار ہم ایک ہی کھانا اور ایک ہی قسم کا پانی کیوں پیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ہم کھانا کھاتے یا پانی پیتے ہیں تو ہم کو ایک نئی بھوک اور نئی پیاس معلوم ہوتی ہے اس لئے ہر وقت کے پانی میں ہم کو ایک نیا لطف ملتا ہے، اور ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ تو وہی پانی ہے جو ہم بار بار پی چکے، اب اس میں کیا مزہ رہا، اسی طرح جو لوگ تشنۂ ایمان ہیں اور جن کو سرچشمۂ ایمان کی تلاش ہے ان کو ہر آیت میں ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے، اور ایک نئی لذت ملتی ہے، اس لئے ان کو تکرار بدمزہ نہیں معلوم ہوتی۔

غرر درر میں شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ (المتوفی ۴۳۶ء) نے اور الفوز الکبیر میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی مکرّراتِ قرآن پر مفصل بحثیں کی ہیں، لیکن اصل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو تکراریں ہیں وہ مختلف قسم کی ہیں اور ان بزرگوں نے جو جوابات دیئے ہیں وہ صرف خاص خاص قسم کی تکراروں کے متعلق ہیں، اس لئے اوّل ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں کس کس قسم کی تکرار ہے۔

قرآن مجید کو غور سے شروع سے آخر تک پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دو قسم کی تکرار ہے، لفظی تکرار اور معنوی تکرار۔

۱) معنوی تکرار سے یہ مقصود ہے کہ ایک ہی مفہوم اور ایک ہی معنیٰ کو خاص الفاظ کی پابندی کے بغیر بار بار کہنا۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ یا نماز کی تاکید مختلف الفاظ میں جابجا آئی ہے، لیکن ان معنوں کے ادا کرنے کے لئے کوئی خاص عبارت نہیں

اختیار کی گئی ہے' بلکہ مختلف طرز اور مختلف طریقوں سے ایک ہی مفہوم ادا کیا گیا ہے۔

۲) لفظی تکرار سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی مفہوم کو کسی خاص عبارت اور الفاظ کے ساتھ بار بار ادا کرنا' مثلاً سورۂ رحمٰن میں ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴾ کی تکرار۔ شریف مرتضٰی کا جواب اسی تکرار سے متعلق ہے۔ ہم پہلے معنوی تکرار کو بیان کرتے ہیں۔

معنوی تکرار

معنوی تکرار عموماً چند موقعوں پر ہے' بعض خالص پُر اثر قصوں کی تکرار' مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت آدمؑ کا قصہ اور بعض خاص خاص فرائض اور عقائد کی تکرار' مثلاً نماز و توحید و معاد کا بیان' خدا کے صفات و احسانات اور مظاہرِ قدرت کا ذکر۔

تکرارِ قصص

قرآن مجید میں جو قصے مذکور ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ بعض قصے ایسے ہیں جن کا بیان قرآن مجید میں دہرا دہرا کر آتا ہے' مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے قصے' اور بعض قصے ایسے ہیں جن کا ذکر کہیں ایک موقع پر آ گیا ہے' اور دوسری مرتبہ بالکل نہیں ہوا' مثلاً ذوالقرنین' اصحابِ کہف' حضرت یوسف' حضرت یونس' حضرت زکریا' حضرت داؤد' حضرت سلیمان' حضرت طالوت وغیرہم کے قصے (صلوات اللہ علیہم اجمعین)

جن انبیاء علیہم السلام کے قصے بار بار آئے ہیں وہ صرف چار ہیں: حضرت آدمؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

اس کے متعلق دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ اوّلاً یہ کہ انہی چار انبیاء کے قصے دہرائے گئے ہیں' ثانیاً یہ کہ ان کے دہرانے کی ضرورت کیا ہے؟

سب سے پہلے ہم کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ قرآن مجید میں اس کثرت سے قصے کیوں مذکور ہیں! اصل یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ غیروں کے حالات اور سرگزشت سے بالطبع نصیحت حاصل کرتا اور متاثر ہوتا ہے۔ اس بنا پر قرآن مجید اور تمام کتبِ سماوی میں جا بجا قصے مذکور ہیں جن سے یہ ثابت ہے کہ قومیں خدا کی نافرمانی سے کس قدر مبتلائے آلام ہوتی ہیں اور نیک نفس قوموں کو خدا کس قدر عروج و

راحت عطا کرتا ہے۔ لیکن چونکہ اس قسم کے قصّے جب تک بار بار کان میں نہ ڈالے جائیں ان سے صحیح عبرت اور کامل اثر نہیں حاصل ہوتا۔ اس لئے قرآن مجید میں ایسے عبرتناک قصّے بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

ایک بڑی وجہ ان قصّوں کے تکرار کی یہ ہے کہ جس طرح ایک دلیل مختلف دعووں پر اثر کرتی ہے' ایک قصّہ سے مختلف نتائج مستنبط ہوتے ہیں اور متعدد قوموں پر ان سے استشہاد پیش کیا جاتا ہے' اس لئے ہر جگہ ان قصّوں کے اعادہ سے مختلف نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کا قصّہ قرآن میں بار بار آیا ہے' مگر غور کرو' ہر جگہ ایک جدید نتیجہ کی طرف اس سے اشارہ کیا گیا ہے' کہیں تو اظہارِ قدرت کے موقع پر حضرت موسیٰؑ کا قصّہ بیان کیا گیا ہے' کہیں بنی اسرائیل پر خدا نے اپنے احسانات کے اظہار کے موقع پر اس قصّہ کا ذکر کیا ہے' کہیں نافرمان قوموں کی ہلاکت پر اس قصّہ سے استشہاد کیا گیا ہے' کہیں اس سے بنی اسرائیل کی شرارت اور کفرانِ نعمت کو ثابت کیا گیا ہے' کہیں اس قصّہ کے ذریعہ سچے نبی اور جھوٹے لوگوں میں فرق بتایا گیا ہے' کہیں اس میں خدا نے حضرت موسیٰؑ پر اظہارِ احسان کیا ہے' کہیں اس سے فرعون کے کفر' غرور اور نخوت کا تذکرہ مقصود ہے' کہیں اس سے انسان کی فطری کمزوری کا اظہار کیا گیا ہے۔ حضرت آدمؑ کے قصّہ سے خدا کے احسانات' انسان کی کمزوری' نفسِ امارہ کی شرارت' نوعِ انسانی کی عظمت' غرور کی مذمت' مختلف باتوں پر استدلال ہوسکتا ہے۔

غرضیکہ تم اس سے نتیجہ نکال سکتے ہو کہ صرف ایک قصّہ سے کس قدر مختلف نتیجے پیدا ہو سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں جو ایک ہی قصّہ کی بار بار تکرار ہوتی ہے' دراصل ہر جگہ اس قصّہ سے ایک جدید نتیجہ کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے' اس لئے وہ تکرار غیر مفید نہیں ہوتی۔

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے' یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام انبیاء میں سے صرف چند خاص انبیاء حضرت آدمؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے واقعات کا اعادہ کیوں بار بار ہوتا ہے؟ اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کے اصلی مخاطب صرف چار تھے: عموماً عام انسان اور خصوصاً مشرکین عرب' یہود اور

نصاریٰ۔ عام نوعِ انسان کی عبرت اور تاثیر کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کے قصے کی تکرار کی جاتی ہے' مشرکین عرب چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بے انتہا گرویدہ اور معتقد تھے' اس لئے ان کے لئے حضرت ابراہیمؑ کے واقعات سے' یہودیوں کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصوں سے استدلال پیش کیا جاتا ہے اور ان ہی چار انبیاء کے نام اور قصے بار بار آتے ہیں۔ اور چونکہ عرب میں خصوصاً مدینہ میں یہودی زیادہ تر آباد تھے اس لئے حضرت موسیٰؑ کا نام سب سے زیادہ آیا ہے' ان کے بعد مشرکین کا درجہ ہے' جن کو حضرت ابراہیمؑ سے تعلق ہے اور آخر میں عیسائی ہیں' چنانچہ اس کی تصدیق ذیل کی تفصیل سے ہوگی:

۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام قرآن مجید میں ۱۳۵ مرتبہ آیا ہے۔

۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام قرآن مجید میں ۶۶ مرتبہ آیا ہے۔

۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام قرآن مجید میں ۲۴ مرتبہ آیا ہے۔

فرائض وعقائد کی تکرار

اکثر فرائض اور عقائد کا بیان نہایت تکرار کے ساتھ آتا ہے اور یہ دراصل وہی چیزیں ہیں جو منتہائے اسلام ہیں اور وہ حسبِ ذیل ہیں:

ایمان' نماز' زکوٰۃ' توحید' صفاتِ خدا' تاکیدِ یادِ خدا' اظہارِ قدرتِ خدا' مذمتِ شرک' قیامت' حشر' جزاء' سزا' ذکرِ موت' ذکرِ دوزخ و جنت' مذمتِ دنیا' اخلاق و عملِ صالح۔

یہی بیانات ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہر جگہ بار بار آتا ہے' خصوصاً ان میں ایمان' نماز' توحید و مذمتِ شرک' دوزخ و جنت کا ذکر نہایت کثرت سے ہے جن کا اندازہ ذیل کے بیان سے ہوگا:

۱) مدحِ توحید و مذمتِ شرک و کفر کا ذکر قرآن مجید میں ۳۵۰ مرتبہ سے زیادہ آیا ہے۔

۲) ایمان کا ذکر اور حکم قرآن مجید میں ۳۰۰ مرتبہ آیا ہے۔

۳) بہشت کا ذکر قرآن مجید میں تقریباً ۱۹۵ مرتبہ آیا ہے۔

۴) دوزخ کا ذکر قرآن مجید میں تقریباً ۲۰۰ مرتبہ آیا ہے۔

۵) نماز کا ذکر اور حکم قرآن مجید میں ۱۰۰ مرتبہ سے زیادہ آیا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ان مذکورہ بالا فرائض وعقائد کے متعلق الفوز الکبیر میں ایک بہت دلچسپ بحث لکھی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے قرآن مجید میں جن امور کا ذکر کیا ہے وہ دو طرح کے ہیں:

اوّل وہ امور ہیں جو محض قانونی اور تشریعی حکم رکھتے ہیں اور جن سے مقصد صرف یہ ہے کہ مخاطب کو اُن کا علم ہو جائے، مثلاً طلاق، خلع، ظہار، ایلاء، وراثت، سزائے سرقہ، قصاص، شہادت، سزائے زنا وغیرہ۔

دوم وہ امور، جو قانونی اور تشریعی نہیں بلکہ وہ ایسے عقائد یا اعمال ہیں جن کے متعلق خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ انسان پر چھا جائیں، انسان میں سما جائیں، انسان بالکل ان میں رنگ جائے، ان کا سخت معتقد یا پابند ہو جائے۔ خدا ان ہی چیزوں کو بار بار کہتا ہے، اور سو سو دفعہ دہراتا ہے تاکہ مخاطب اس قدر متاثر ہو جائے کہ ہل نہ سکے۔ ایمان، نماز، روزہ، توحید، حشر، جزاء، سزا وغیرہ جن کا ذکر قرآن مجید میں ہر جگہ ہے، وہ اسی قسم کے امور ہیں، جن کی تکرار سے مقصود یہ ہے کہ یہ چیزیں نفس پر بالکل چھا جائیں۔

اس کی صحیح مثال یہ ہے کہ اگر ہم خیام اور حافظ کو غور سے پڑھیں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس رندی و عاشقی کے صرف چند مضامین ہیں جن کو وہ الٹ پھیر کر ہمیشہ باندھا کرتے ہیں، لیکن جب ہمارے سامنے کوئی شعر اُن کا آ جاتا ہے تو ہم اس سے ایک نیا لطف حاصل کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی بار بار تلاوت کرنے کا اسلام نے جو حکم دیا ہے اس کا بھی یہی راز ہے۔ شاہ صاحبؒ کی اصل عبارت یہ ہے:

> اگر پرسند مطالب فنون خمسہ چرا در قرآن عظیم مکرر گفتہ شد، چرا یک اکتفا نہ رفت گویم آنچہ خواہم کہ سامع را افادہ نمایم دو قسم می باشد، تعلیم مالا یعلم بود (غیر معلوم امر کا بتانا) پس مخاطب حکمے را نمی دانست و ذہن او ادراک او نہ کردہ بود باستماع ایں کلام آں مجہول معلوم شود، و آں نادانستہ، دانستہ گردد و دیگر آنکہ مقصود گیرد استحضار صورت آں علم در مدرکہ او باشد تا ازاں لذت فراواں گیرد و قوائے قلبیہ و ادراکیہ دراں علم فانی شوند و رنگ ایں علم بر ہمہ قویٰ غالب آید،

چنانکہ معنی شعری را کہ ما آں را دانستہ ایم مکرّر می گوید و ہر بار لذتے می یابیم و بریں لذت تکرار آں دوست می داریم' لہٰذا در شریعت بہ تکرار تلاوت امر فرمودند (الفوز الکبیر' مطبوعہ کلکتہ' ص ۸۶'۸۷)

یہ جواب حرف بحرف صحیح ہے اور اس پر کسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔

لفظی تکرار

قرآن مجید میں لفظی تکرار بھی بہت ہے۔ ایک ایک آیت ایک ہی سورۃ میں بیسیوں مرتبہ آتی ہے' ایک ہی آیت میں ایک ایک لفظ یکے بعد دیگرے دُہرا دیا جاتا ہے۔

ہم پہلے الفاظ کی تکرار کو بیان کرتے ہیں۔ اس قسم کی تکرار ہر زبان میں موجود ہے اور اس کو اصطلاحِ نحو میں تاکید کہتے ہیں۔ ہم ہمیشہ بولتے ہیں دیکھو دیکھو' نہیں نہیں' زید زید۔ اس دوسرے لفظ سے مقصود صرف کلام پر زور ڈالنا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی جن آیتوں میں اس قسم کی تکرار ہے وہ محض تاکید کے لئے ہے۔ اس تکرار کی چند مثالیں یہ ہیں:

﴿اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی ۞ ثُمَّ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی ۞﴾ (القیامۃ: ۳۴'۳۵)

''ہلاکت ہو تمہارے لئے ہلاکت' پھر ہلاکت ہو تمہارے لئے پھر ہلاکت''۔

﴿کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۞ ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۞﴾ (التکاثر: ۳'۴)

''ہرگز نہیں' تم عنقریب جان لوگے' پھر ہرگز نہیں' تم عنقریب جان لوگے''۔

عربی اشعار میں بھی اس قسم کی تکرار کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ خنساء کہتی ہے:

اردت لنفسی بعض الامور

فاولی لنفسی اولی بھا

''میں نے اپنے لئے بعض چیزوں کا ارادہ کیا' تو ہلاکت ہو میرے نفس کے لئے ہلاکت''۔

قراء نے اس قسم کی تاکید کی مثالیں بہت سی پیش کی ہیں جن کو ہم غرر درر سے نقل کرتے ہیں:

کائن وکم عندی لھم من صنیعة

ایاوی ثنوّھا علیّ واوجبوا

''ان لوگوں کے کتنے اور کتنے احسان ہم پر ہیں' ایسے احسانات جن کو دوبارہ

انہوں نے کیا۔''

دیکھو اس مصرع میں الفاظ کی کتنی تکرار ہے:

کم نعمۃً کانت لکم کم کم و کم

''کتنے تمہارے احسانات ہیں' کتنے' کتنے اور کتنے؟''

ایک عربی شاعر کہتا ہے۔

نعق الغراب بین لبنی غدوۃ

کم کم و کم لفراق لبنی تنعق

''کوّے نے صبح کو لبنیٰ کے فراق کی آواز دی۔ اے کوّا تو لبنیٰ کے فراق کی کتنی' کتنی اور کتنی آواز دے گا''۔

حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے تاکیدی الفاظ کی تکرار عربی زبان میں کثرت سے ہے' اور قرآن مجید میں بھی یہ اسلوب جا بجا استعمال کیا گیا ہے۔

اب صرف ایک بات بیان کرنی رہ گئی' قرآن مجید کی ایک ہی سورۃ میں ایک ایک آیت کی تکرار بار بار کی جاتی ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ (تو تم اپنے خدا کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟) ۳۱ مرتبہ' ایک ایک آیت کے بعد آیا ہے' سورۃ المرسلات میں ﴿وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ﴾ (اُس دن (انبیاء کی) تکذیب کرنے والوں پر افسوس ہے) ایک دو آیات کے بعد گیارہ مرتبہ آیا ہے' سورۃ القمر میں بھی اسی قسم کی تکرار ہے۔

اس کا جواب مختلف پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے۔

۱) قرآن مجید میں ہر جگہ مؤثر اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ جب ہمارا مقصود یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو ہر طرح سے متاثر کر دیں' تو ایک ایک جملے کو بار بار کہتے ہیں' اور مخاطب پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً ایک شخص پر تم نے کثرت سے احسانات کئے' وہ اپنے طرزِ عمل سے ان احسانات کا انکار کرتا ہے تو تم اس کو اس طرح سمجھاتے ہو: تم ہمارے کن کن احسانات کا انکار کرو گے' کیا ہم نے تم پر یہ احسان نہیں کیا کہ تم کو رہنے کو گھر دیا' کیا یہ احسان نہیں کیا کہ تم کو روپے دے دیئے' یہ احسان نہیں کیا کہ تم کو پڑھایا۔ قرآن مجید

میں ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ کی تکرار بھی اسی قسم کی ہے۔ دیکھو:

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۞ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۞ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ۞ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞ فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ ۞ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞﴾ (الرحمٰن:۴۶۔۵۳)

''جو اپنے خدا کے آگے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کو دو جنتیں ملیں گی۔ تم اپنے خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے؟ ان جنتوں میں ہری شاخیں ہوں گی۔ تم اپنے خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے؟ ان میں دو نہریں بھی جاری ہوں گی۔ تم اپنے خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے؟ ان میں ہر میوہ دو دو قسم کا ہوگا' تم اپنے خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے؟''

دوسری جگہ خدا قیامت اور عذاب کا حال بیان فرماتا ہے' اور اُس وقت منکرین کی افسوس ناک حالت سے عبرت دلاتا ہے:

﴿کَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۞ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ۞ هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ ۞ وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ ۞ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ۞ هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰکُمْ وَالْاَوَّلِیْنَ ۞ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ کَیْدٌ فَکِیْدُوْنِ ۞ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ۞﴾ (المرسلٰت:۳۳۔۴۰)

''دوزخ کے شعلے زرد اونٹوں کی طرح ہوں گے۔ اس دن جھٹلانے والوں پر افسوس ہے۔ یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ بول سکیں گے اور نہ ان کو اجازت دی جائے گی کہ عذر کریں۔ اس دن جھٹلانے والوں پر افسوس ہے۔ یہ فیصلہ کا دن ہے' ہم نے تم کو اور تمہارے اسلاف کو جمع کر دیا ہے۔ اگر تم کوئی تدبیر کر سکتے ہو تو مجھ سے کرو۔ اس دن جھٹلانے والوں پر افسوس ہے''۔

تم دیکھتے ہو کہ یہ طرزِ تکرار کس قدر مؤثر ہے۔

۲) مولانا آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ عربی کے قصائد اور غزلوں میں ردیف نہیں ہوتی اور نہ عرب میں دیگر اصنافِ سخن مخمس وغیرہ مستعمل ہیں جن میں ایک مصرع بار بار آتا ہے۔ قرآن مجید نے عرب کے لٹریچر پر چونکہ بہت سے اصنافِ سخن کا اضافہ

کیا ہے اسی لئے سورۃ الرحمٰن وغیرہ میں جو ایک ہی آیت بار بار آتی ہے اس کو گویا غزل مردف سمجھنا چاہئے' جس میں ایک ہی لفظ ہر شعر کے آخر میں آتا ہے۔

۳) شریف مرتضیٰ نے تکرارِ آیات کا بہت اچھا جواب دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ عرب کے اصنافِ سخن میں ایک قسم یہ بھی ہے کہ قصیدہ میں ایک ہی مصرع کو بار بار کہنا۔ قرآن مجید گو نثر ہے لیکن اس میں چونکہ عرب کے تمام اصنافِ کلام موجود ہیں' اس لئے بعض سورتوں میں صنف تکرار بھی اختیار کی گئی ہے۔ اس صنف کی مثالیں شعرائے عرب کے یہاں بہت ملتی ہیں۔ شریف مرتضیٰ نے چند مثالیں دی ہیں۔ ہم اور بھی بہت سی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

مہلہل بن ربیعہ ایک مشہور جاہلی شاعر ہے' وہ کلیب کے مرثیہ میں لکھتا ہے:

الا ان لیس عدلاً من کلیب
اذا خاف المغار من المغیر
الا ان لیس عدلاً من کلیب
اذا طر والیتیم من الجزور
الا ان لیس عدلاً من کلیب
اذا ما ضیم جیران المجیر
الا ان لیس عدلاً من کلیب
اذا رجف العضاۃ من الدبور
الا ان لیس عدلاً من کلیب
اذا خرجت مخباۃ الخدور
الا ان لیس عدلاً من کلیب
اذا ما اعلنت نجوی الامور
الا ان لیس عدلاً من کلیب
اذا ضاقت رحیبات الصدور

الا ان لیس عدلاً من کلیب
اذا ما خار جار المستجیر
الا ان لیس عدلاً من کلیب
اذا طالت مقاسات الامور
الا ان لیس عدلاً من کلیب
اذا هبّت ریاح الزمهریر

اسی طرح سے بیس مرتبہ ایک ہی قصیدہ میں ایک مصرع کو دہراتا گیا ہے۔ دوسری جگہ مہلہل کہتا ہے۔

ذهب الصلح او ترددا کلیبا
وتحلوا علی الحکومة حلا
ذهب الصلح او ترددا کلیبا
او تذوقوا السیوف ورداونهلا

اس قصیدہ میں چھ مرتبہ یہی مصرع بار بار آیا ہے۔ مہلہل کہتا ہے۔

علی ان لیس یوفی من کلیب
اذا قودوا الیک فلا تقاد
علی ان لیس یوفی من کلیب
لا عطاء الطرائف والتلاد

اس قصیدہ میں سترہ مرتبہ ایک ہی مصرع کی مہلہل نے تکرار کی ہے۔ حارث بن عبادہ جاہلی اپنے بیٹے کے مرثیہ میں کہتا ہے۔

قربا مربط النعامة منّی
لقحت حرب وائل عن حیال
قربا مربط النعامة منّی
لیس دون اللقاء من اعتلال

حارث نے اس مرثیہ میں ایک ہی مصرع کو چوالیس بار دہرایا ہے۔ مہلہل اس مصرع کے جواب میں کہتا ہے:

قربا مربط المشهّر منی
کل شقر او اشقر ذی بال
قربا مربط المشهّر منی
فکلیب الشاب منی قذالی

اس قصیدہ میں بھی ایک مصرع چالیس دفعہ دہرایا گیا ہے۔ لیلیٰ خیلیہ جو امیر معاویہ ؓ کے زمانہ کی ایک مشہور شاعرہ عورت ہے' توبہ کے مرثیہ میں کہتی ہے:

لنعم الفتی یا توب کنت اذا التفت
صدور العوالی واستشال السوافل
ولنعم الفتی یا توب کنت ولم تکن
لتسبق یوما کنت فیه تجادل

اس مرثیہ میں لیلیٰ دو چار مصرعوں کو لے کر پورے قصیدہ میں ان کو دہراتی چلی گئی ہے۔ عمرہ بنت نعمان اپنے شوہر کے مرثیہ میں کہتی ہے:

وحدثنی اصحابه ان مالکا
اقام ونادی صحبه برحیل
وحدثنی اصحابه ان مالکا
ضروب تبصل الیف غیر نکول(۱)

پھر بار بار اسی مصرع کو دہراتی چلی گئی ہے۔

اس قسم کی لفظی اور معنوی تکرار صرف قرآن مجید ہی میں نہیں ہے بلکہ تورات میں بھی موجود ہے۔ حضرت موسیٰ ؑ کا قصہ تورات میں مختلف نتائج کے لئے بیسیوں جگہ آیا ہے۔ لفظی تکرار بھی کثرت سے ہے۔ ایک مقام پر ہے:

(۱) یہ تمام مذکورہ بالا اشعار حرب بکر وتغلب میں ہیں۔

تم میری سنتوں کی محافظت کرو' اور میرے مقدس سے ڈرو' میں خداوند ہوں اور تم بھان متی اور جادوگروں پر التفات نہ کرو۔ اور ان کے طالب نہ ہو کہ ان کے سبب سے ناپاک ہو جاؤ گے۔ میں (۱) خداوند تمہارا خدا ہوں' تو اس کے لئے جس کا سر سپید ہو اٹھ کھڑا ہوا اور بوڑھے مرد کو عزت دے۔ اور اپنے خدا سے ڈر' میں خداوند ہوں' اگر کوئی مسافر تیری زمین پر تیرے ساتھ سکونت کرے تو اس کو مت ستا' بلکہ مسافر کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ایسا جانو جیسے وہ تم میں پیدا ہوا ہے' اور ایسا پیار کرو جیسا آپ کو کرتا ہے' اس لئے کہ تم مصر کی زمین پر پردیسی تھے' میں خداوند تمہارا خدا ہوں' تم انصاف کرنے میں' پیمائش کرنے میں' تولنے میں' ناپنے میں بے انصافی نہ کرو' چاہئے کہ تمہاری ترازو' پورے پیمانے پوری دس سیریاں ہوں' میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ (۲) جو تم کو زمین مصر سے نکال لایا سو تم میری ساری شریعتوں اور ساری عدالتوں کی حفاظت کرو اور ان پر عمل کرو' میں خداوند خدا ہوں۔'' (احبار' باب ۱۹)

آخر میں ایک بات کہنی اور باقی رہ گئی۔ دشمنانِ اسلام کا یہ بھی اعتراض ہے کہ سورۃ الرحمٰن میں بعض جگہ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ کی تکرار بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً:

﴿یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۞ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ وَرْدَةً کَالدِّهَانِ ۞ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞ فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۞ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞ یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ ۞ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُکَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۞ یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَبَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ۞ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞﴾ (الرحمٰن: ۳۵۔۴۵)

''تم پر آگ پگھلے ہوئے تانبے کا شعلہ بھیجا جائے گا اور تم اپنے کو نہ روک سکو

---

(۱) میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ اس فقرہ کی تکرار احبار' باب ۱۸' ۱۹ میں بہت جگہ ہے۔ میں نے صرف آخری حصہ لیا ہے۔ (۲) ایضاً

گے۔تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے؟ جب آسمان پھٹ جائے گا تو سرخ مثل تیل کے ہو جائے گا۔تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے؟ اس دن کسی انسان اور جن کا گناہ نہ پوچھا جائے گا۔تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے؟ گنہگار اپنی علامت سے پہچان لئے جائیں گے' تو سر کے بال اور پاؤں پکڑ کر (ڈالے جائیں گے)۔تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے؟ یہی وہ جہنم ہے جس کا گنہگار انکار کرتے تھے' اس آگ اور گرم پانی کے درمیان طواف کریں گے۔تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے؟''

ظاہر ہے کہ ان آیتوں میں جہنم و دوزخ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔یہ عذاب ہے' نعمت نہیں۔اس لئے اس کے بعد یہ کہنا کہ تم خدا کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے' ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔

جمہور مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ جہنم و دوزخ گو خود نعمت نہیں ہیں' لیکن جہنم و دوزخ کے حالات بیان کر کے انسان کو عبرت دلانا ایک نعمت ہے۔ظاہر ہے کہ یہ جواب کسی قدر تاویل بارد ہے! ہمارے نزدیک اس کا اصلی جواب یہ ہے کہ جہنم و دوزخ گو خاص خاص گنہگار افراد انسان کے لئے نعمت نہیں ہے لیکن عام نوعِ انسان کے لئے خدا کا دوزخ کو پیدا کرنا بھی ایک عظیم الشان نعمت ہے' جس کے خوف سے مجرم انسان صالح ہو جاتا ہے۔

اس کا دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سورۃ میں قرآن مجید نے جس صنفِ کلام کا استعمال کیا ہے اس میں یہ بھی اجازت ہے کہ گو اس مکرّر مصرع کو جو ہر شعر میں آتا ہے' دوسرے مصرع سے تعلق نہ ہو (بلکہ پہلے مصرعوں سے تعلق ہوتا ہے) مگر پھر بھی اس کو دہرا دیتے ہیں۔مہلہل کے مذکورہ بالا قصیدہ کے دو شعر سند میں پیش ہیں۔

قربا مربط المشهّر منی

لیت شعری وذاک انعم حال

''مشہر (گھوڑے کا نام) کا اصطبل میرے قریب لاؤ' کاش میں جانتا اور یہ بہتر حالت ہے''۔

قــربــا مــربــط الــمشهــر منــى
مــن يكــون الــغــداة رهن العوالى

''مشہر کا اصطبل میرے قریب لاؤ' کہ کل کون نیزوں کی نذر ہوگا''۔

دیکھو ان دو شعروں میں پہلے مصرع کو دوسرے مصرع سے کوئی تعلق نہیں' اور نہ تیسرے مصرع کو چوتھے مصرع سے تعلق ہے' بلکہ دوسرے مصرع کو چوتھے مصرع سے تعلق ہے' مگر پھر بھی مکرّر مصرع کو مہلہل نے ان دونوں شعروں میں دہرادیا ہے۔

قرآن مجید میں بھی اس موقع پر گو دوزخ و جہنم کے ذکر کو ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۞﴾ سے تعلق نہیں' بلکہ اس کے ماقبل اور مابعد سے تعلق ہے' مگر پھر بھی اس کو دہرادیا گیا ہے تاکہ سلسلۂ تکرار ٹوٹنے نہ پائے۔

علومِ قرآن دراصل ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ اس قسم کے نکتے صرف اس دریا کے چند حباب ہیں۔

(بشکریہ تعمیر حیات' لکھنؤ)

۞ ۞ ۞

- نظام خلافت کیا ہے؟ • یہ کن بنیادوں پر قائم ہو گا؟
- عہد حاضر میں نظام خلافت کا دستوری' قانونی' معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ کیا ہو گا؟
- اس کے قیام کے لئے سیرت نبویؐ سے ماخوذ طریق کار کون سا ہے؟

ان تمام سوالات کے جامع' واضح اور مدلل جوابات پر مشتمل ایک بیش قیمت علمی دستاویز

''خطباتِ خلافت''

امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان
ڈاکٹر اسرار احمد کے چار خطبات کا مجموعہ

سفید کاغذ' عمدہ طباعت' صفحات 212' قیمت : (اشاعت خاص)80 ' اشاعت عام : 45 روپے

''سعادت'' اور ''حصولِ سعادت''

سید وصی مظہر ندوی☆

سعادت کی حقیقت

مابعد الطبعی فلسفہ، علم الاخلاق اور معاشرتی علوم کے مباحث میں یہ مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے کہ انسان کو کامیاب اور خوش قسمت قرار دینے کا معیار کیا ہے۔ کون سا شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اسے آخری طور پر کامیاب اور بامراد تسلیم کیا جائے۔ شاہ صاحبؒ نے اسی کامیاب یا بامراد ہونے کو ''سعادت'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے دور میں فلسفہ اور علم الاخلاق میں یہی اصطلاح معروف و مشہور تھی۔ بہر حال کامیابی اور خوش بختی یا ''سعادت'' کی حقیقت ہر نظامِ فکر و فلسفہ میں علیحدہ علیحدہ بیان کی گئی ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد دراصل اس اختلاف پر ہے جو اِس کائنات اور کائنات میں انسان کے مقام و مرتبہ کے سلسلہ میں پایا جاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس سلسلہ میں پائے جانے والے مختلف نظریات کا ذکر کر کے ان کو مدلل طور پر ردّ کیا ہے اور پھر اسلامی فکر کے مطابق انسان کے مقام کو متعین کر کے اس کی سعادت اور شقاوت کے معیار کو واضح کیا ہے۔ ان صفحات میں شاہ صاحب کی تحقیق کے مطابق صرف ''سعادت'' اور ''حصولِ سعادت'' کے طریقے کو بالاختصار پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سب سے پہلے شاہ صاحب نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اسلامی تعلیمات اور انسان کی حقیقت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر ایک تو وہی حیوانی روح ہے جو تمام حیوانات میں پائی جاتی ہے اور جو مادی عناصر میں ایک خاص طرح کی ترتیب نمودار ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ

☆ برامپٹن۔ اونٹاریو (کینیڈا)

حیوانی روح حواسِ خمسہ کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کے بہیمی یا حیوانی تقاضوں کا ادراک بھی رکھتی ہے اور ان تقاضوں کی تکمیل کے لئے پوری شدت کے ساتھ سرگرم عمل رہتی ہے۔ بدل ما یتحلل (جسم کے تحلیل ہوتے رہنے والے حصوں کا بدل) کے لئے مناسب غذا کی تلاش اور تیاری' غذا کھانے کے بعد اس کے ہضم کا اہتمام' جسم کے ہر حصے کو اس کی ضرورت کے مطابق ہضم شدہ غذا پہنچانا' شدید سردی' شدید گرمی یا دیگر نامناسب موسمی حالات سے بچنے کی طرف توجہ' خطرات سے محفوظ رہنے کا انتظام' جسم کے خود کار اندرونی نظام کی دیکھ بھال' تھکاوٹ دور کرنے کے لئے آرام اور بقائے نسل کے لئے دیگر ضروری انتظامات سب اسی روحِ حیوانی یا اس کی بہیمی قوت کی کارفرمائیاں ہیں۔

لیکن انسان جس روح کی وجہ سے انسان کہلانے کا مستحق بنتا ہے وہ مَلکی یا مَلکوتی روح ہے جو اللہ تعالیٰ روحِ حیوانی پر اپنے فیضان سے نازل فرماتا ہے۔ چونکہ یہ روح مَلکوتی الاصل ہے اس لئے یہ انسان کو مَلکی خصوصیات اور اوصاف کی بلندیوں کی طرف لے جانا چاہتی ہے اور بہیمی تقاضوں پر بھی اس طرح اثر ڈالتی ہے کہ وہ بھی مَلکی اوصاف کے رنگ میں کم و بیش رنگ جائیں۔ چنانچہ انسان کی ''سعادت'' اور کامیابی یہ ہے کہ اس کی روحِ حیوانی' روحِ مَلکی کی تابع ہو جائے اور اپنے تمام حیوانی تقاضوں کو بھی اس انداز میں پورا کرے جو روحِ مَلکی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔

اس ''سعادت'' کے حصول کے لئے دو طریقے معروف ہیں۔ ایک یہ طریقہ کہ بہیمیت اور اس کے تقاضوں کو سخت ترین مشقتوں کے ذریعہ بالکل ہی کچل کر رکھ دیا جائے اور صرف مَلکوتی تقاضوں کو پورا کرنے کی زبردست جدوجہد کی جائے' مگر اس طریقہ کار میں دو بڑی خرابیاں ہیں:

(۱) ایک خرابی تو یہ ہے کہ اس طریقے پر عمل کرنے والے انسانی تمدن اور اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ جنگلوں' پہاڑوں اور غاروں میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لباس سے بھی اکثر بے نیاز ہوتے ہیں۔ بقائے نوع کے تقاضوں کو

بھی پس پشت ڈالتے ہیں۔ فاقوں میں زیادہ وقت بسر کرتے ہیں۔ بھوک کی شدت اگر بڑھ جائے تو جنگل کی جڑی بوٹیوں یا پھلوں پر قناعت کرتے ہیں۔ چنانچہ تمام انسان یا ان کی ایک بڑی تعداد حصولِ سعادت کے اس طریقے پر اگر عمل پیرا ہو جائے تو انسانی تمدن کا ارتقاء یکسر رک جائے گا' جبکہ قرآن حکیم نے تو انسان کو بھرپور تمدنی زندگی گزارنے کی ترغیب دی ہے اور دنیا کی آرائش وآسائش کو اللہ کے انعام سے تعبیر کیا ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ﴾ (الاعراف:۳۲)

''پوچھو! اللہ کی اتاری ہوئی زینت وآرائش کو اور رزق کی پاک چیزوں کو کس نے حرام ٹھہرایا ہے جسے اس نے اپنے بندوں کے لئے نکالا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (الروم:۲۱)

''اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان کے پاس جا کر سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھی۔ اس میں یقیناً نشانیاں ہیں ان کے لئے جو فکر کریں۔''

(۲) اس طریقے کی دوسری خرابی یہ ہے کہ بہیمی قوت اور اس کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر دینا یا کچل ڈالنا چونکہ فطرت کے خلاف ہے اس لئے اس طریقے پر چلنے والے اپنے مقصد میں مکمل طور پر کبھی کامیاب نہیں ہوتے' بلکہ اکثر بہیمی تقاضے اتنے شدید ہو جاتے ہیں کہ تمام بندھنوں اور حدوں کو توڑ کر طالب رہبانیت کو اپنے سیلاب میں بہا لے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طریقے پر چل کر حصولِ سعادت کی کوشش کرنے والے دنیا میں ہمیشہ بہت تھوڑی تعداد میں رہے ہیں اور ان میں سے وہ لوگ تو تقریباً معدوم ہی ہیں جو اپنے مقصد اور منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہوں۔ اکثر تو حصولِ مقصد کے لئے مشقتیں ہی جھیلتے رہے یا پھر بہیمیت کے منہ زور سیلاب میں بہہ گئے۔

انبیاء علیہم السلام اور اللہ کے رسول چونکہ جمہور انسانوں کی تعلیم وتربیت اور ان کو کامیاب و بامراد بنانے کی ذمہ داری ادا کرنے کے لئے اٹھائے جاتے ہیں اس لئے

بھی پس پشت ڈالتے ہیں۔ فاقوں میں زیادہ وقت بسر کرتے ہیں۔ بھوک کی شدت اگر بڑھ جائے تو جنگل کی جڑی بوٹیوں یا پھلوں پر قناعت کرتے ہیں۔ چنانچہ تمام انسان یا ان کی ایک بڑی تعداد حصولِ سعادت کے اس طریقے پر اگر عمل پیرا ہو جائے تو انسانی تمدن کا ارتقاء یکسر رک جائے گا' جبکہ قرآن حکیم نے تو انسان کو بھرپور تمدنی زندگی گزارنے کی ترغیب دی ہے اور دنیا کی آرائش و آسائش کو اللہ کے انعام سے تعبیر کیا ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ﴾ (الاعراف:۳۲)

''پوچھو! اللہ کی اتاری ہوئی زینت و آرائش کو اور رزق کی پاک چیزوں کو کس نے حرام ٹھہرایا ہے جسے اس نے اپنے بندوں کے لئے نکالا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (الروم:۲۱)

''اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان کے پاس جا کر سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھی۔ اس میں یقیناً نشانیاں ہیں ان کے لئے جو فکر کریں۔''

(۲) اس طریقے کی دوسری خرابی یہ ہے کہ بہیمی قوت اور اس کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر دینا یا کچل ڈالنا چونکہ فطرت کے خلاف ہے اس لئے اس طریقے پر چلنے والے اپنے مقصد میں مکمل طور پر کبھی کامیاب نہیں ہوتے' بلکہ اکثر بہیمی تقاضے اتنے شدید ہو جاتے ہیں کہ تمام بندھنوں اور حدوں کو توڑ کر طالب رہبانیت کو اپنے سیلاب میں بہا لے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طریقے پر چل کر حصولِ سعادت کی کوشش کرنے والے دنیا میں ہمیشہ بہت تھوڑی تعداد میں رہے ہیں اور ان میں سے وہ لوگ تو تقریباً معدوم ہی ہیں جو اپنے مقصد اور منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہوں۔ اکثر تو حصولِ مقصد کے لئے مشقتیں ہی جھیلتے رہے یا پھر بہیمیت کے منہ زور سیلاب میں بہہ گئے۔

انبیاء علیہم السلام اور اللہ کے رسول چونکہ جمہور انسانوں کی تعلیم و تربیت اور ان کو کامیاب و بامراد بنانے کی ذمہ داری ادا کرنے کے لئے اٹھائے جاتے ہیں اس لئے

ان کی تعلیمات میں ''حصولِ سعادت'' کے پہلے طریقے کے بارے میں چند اشارات ملتے ہیں۔ البتہ حصولِ سعادت کے دوسرے طریقے کو انہوں نے خوب کھول کھول کر بیان کیا ہے اور اس کی تمام جزئیات کی نشاندہی کی ہے' کیونکہ ان کی بعثت اصلاً اسی طریقے کی تعلیم کے لئے ہوتی ہے۔ اس دوسرے طریقے کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مَلکوتی صفات میں رنگنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے اور بہیمی تقاضوں کی تکمیل کے لئے بھی وہ طریقے اختیار کرے جو مَلکوتی اوصاف سے قریب تر ہوں تا آنکہ فی الجملہ بہیمی قوت مَلکی قوت کے تابع بن جائے۔

مَلکوتی اوصاف

قرآن حکیم سے ملائکہ کی جو امتیازی خصوصیات معلوم ہوتی ہیں وہ چار ہیں۔ چنانچہ جو شخص ان خصوصیات یا صفات میں جتنا زیادہ ملائکہ سے قریب ہوگا اتنا ہی وہ کامیاب اور بامراد یا صاحبِ سعادت ہوگا۔ یہ چار خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱) طہارت

ملائکہ کی ان چار صفات میں سے پہلی صفت طہارت ہے۔ چونکہ ان کی تخلیق میں مادے کو دخل نہیں ہے اور جیسا کہ معلوم ہے کہ وہ نورانی مخلوق ہیں اس لئے وہ تمام مادی گندگیوں سے دور ہیں۔ وہ چونکہ غذا کے محتاج نہیں اس لئے نہ وہ حدثِ اکبر (جنابت) میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ حدثِ اصغر میں۔ چنانچہ ان کو غسل کی حاجت ہوتی ہے نہ وضو کی۔

ملائکہ کی اس صفت سے مشابہت اور مطابقت پیدا کرنے کے لئے شریعت میں احکامِ طہارت کا ایک وسیع باب ہے۔ ہر قسم کی ظاہری اور حکمی نجاستوں سے بدن' لباس اور دیگر متعلقات کو پاک رکھنے کے لئے تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں' بلکہ یہاں تک فرمایا گیا ہے:

((اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ)) (مسلم)

''طہارت ایمان کا نصف (یا ایمان کا جزو) ہے۔''

نیز قرآن حکیم میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ (البقرۃ:۲۲۲)

''اللہ تعالیٰ توبہ (رجوع) کرنے والوں اور خوب پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ (التوبۃ:۱۰۸)

''اللہ تعالیٰ خوب پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

۲) اِخبات

ملائکہ کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ جلال وعظمت کی طرف ہمہ وقت متوجہ رہتے ہیں۔ اس کی تسبیح وتقدیس اور حمد کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اپنی عاجزی' بے بسی' ضعف اور ناتوانی کو اچھی طرح جانتے اور اس کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں۔ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کے احکام کے منتظر رہتے ہیں اور جو بھی حکم ملتا ہے اسی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ﴾ (الانبیاء:۲۰)

''وہ رات ودن تسبیح کرتے ہیں' وقفہ نہیں کرتے۔''

مگر اخبات کے اصل معنی تواضع اور پستی اختیار کرنے کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ مادہ تین آیات میں وارد ہوا ہے۔ ہر جگہ اس کا یہی مفہوم ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (ھود:۲۳)

''بیشک جو لوگ ایمان لائے' صالح عمل کئے اور جنہوں نے اپنے رب کی طرف اخبات (تواضع اور پستی) کو اختیار کیا وہی لوگ جنت والے ہیں' اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اخبات ہی سے ملتے جلتے معنی میں قرآن مجید میں انابت بھی استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح خشوع اور خضوع کے کلمات کا مفہوم بھی اس سے قریب ہے۔ قنوت (باادب پیش ہونا) بھی اسی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ بہر حال فرشتوں میں یہ صفت بدرجہ اَتم پائی جاتی ہے۔ شریعت میں ''اِخبات'' کی صفت پیدا کرنے کے لئے بہت زیادہ اہتمام کیا

گیا ہے' مثلاً یہ کہ:

ا) اللہ تعالیٰ کی صفاتِ قدرت و کمال اور عظمت و جلال' اس کی شان استغناء' اس کی قہرمانی اور غلبہ' اور اس سب کے مقابلے میں مخلوقات بالخصوص انسان کی عاجزی اور بے بسی کو خوب کھول کر اور بار بار بیان کیا گیا ہے۔

ب) ان صفات کو مستحضر رکھنے کی غرض سے ہمہ وقت ''ذکر'' کرتے رہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ پانچ وقت کی نماز ذکر کے لئے اور خشوع و خضوع نیز قنوت کے لئے شروع کی گئی۔ فرائض کے علاوہ نوافل بالخصوص نمازِ تہجد کو دأب الصالحین (صالحین کی روش) کے طور پر جاری کیا گیا۔

ج) نماز کے علاوہ روزے' حج نیز قربانی کی عبادات فرض کی گئی ہیں۔

د) نبی ﷺ نے صبح سے شام تک ہر موقع کے لئے دعائیں سکھائی ہیں اور دن میں بکثرت استغفار کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

ہ) قرآن مجید کی تلاوت بہت بڑا ذکر ہے' حتیٰ کہ قرآن مجید کے ناموں میں سے ایک اہم نام ''الذکر'' ہے۔

اگر انسان ان تمام باتوں پر حتی الوسع شعور کے ساتھ کاربند رہے تو اس کے اندر ''اخبات'' کی صفت نہ صرف پیدا ہوتی ہے بلکہ پروان چڑھتی چلی جاتی ہے۔

۳) سماحت

فرشتوں کی تیسری امتیازی خصوصیت یا صفت ''سماحت'' ہے۔ سماحت کے اصل معنی طبیعت کی وہ نرمی ہے جو اپنی ذات اور اپنے مفاد کے ساتھ گہری دلچسپی یا محبت نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے آدمی ایثار اور سخاوت کو بڑی خوش دلی کے ساتھ اختیار کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فرشتے کوئی بھی کام اپنے ذاتی مفاد کے لئے کرتے ہی نہیں' ان کا وجود اس عالم کے مفاد اور بہتری کے لئے ہے۔ چنانچہ نظامِ عالم کی بہتری اور انسان کی ہدایت اور ترقی کے لئے وہ تمام احکامِ الٰہی کو خوشی سے انجام دیتے ہیں۔ چونکہ ان کا وجود خود اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ کائنات کی بھلائی اور

خدمت کے لئے ہے چنانچہ جب اللہ تعالیٰ عالم کے نظام میں کوئی تبدیلی چاہتا ہے تو وہ اس کو روبعمل لانے کے لئے سرگرم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب وہ بندوں میں سے کسی کو پسند کرتا ہے تو وہ بھی اسے پسند کرنے لگتے ہیں اور اس کی تائید وحمایت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جب کسی کے خلاف نفرت کا فیصلہ ہوتا ہے تو وہ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔

یہی سماحت کی صفت اللہ کے جن بندوں میں پیدا ہو جاتی ہے ان کی دلچسپی اپنے کھانے' پینے' پہننے' اوڑھنے اور عیش وآرام سے کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان باتوں کی ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی ہے۔ کھانا اچھا لگا کھالیا' نہ اچھا لگا چھوڑ دیا۔ نہ اچھے کھانے کی تعریف وتحسین نہ بدذائقہ کھانے کی مذمت اور برائی۔ دوسروں کو کھلا کر زیادہ خوش' خود ملا تو کھالیا نہیں تو روزے کی نیت کرلی۔ ساری تگ و دو قوم اور معاشرے کی بھلائی کے لئے' اپنی ذات کے لئے بقدرِ ضرورت۔ دوسروں کی بھلائی کے لئے جان و مال کی ہر قربانی کے لئے خوش دلی سے تیار۔ سماحت کی صفت رکھنے والوں کا یہ انداز اور یہ مزاج ہوتا ہے۔ وہ بھی ضروریات کے لئے مادّی اشیاء استعمال ضرور کرتے ہیں لیکن ان کی محبت میں مبتلا نہیں ہوتے۔ شریعت کے احکام اور دینی تعلیم کا ایک وسیع باب اسی سماحت کی صفت پیدا کرنے کے لئے ہے۔ اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے جان و مال کی قربانی بھی وہی شخص خوش دلی سے دے سکتا ہے جس کے اندر سماحت کی صفت ہو۔

۴) عدالت

چوتھی مَلکوتی صفت ''عدالت'' ہے۔ یہ اصطلاح شاہ صاحبؒ نے جس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے وضع کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو بھی کام انسان کسی وسیع تر فائدہ' اجتماعی مفاد اور کلی فکر کے تحت انجام دیتا ہے اسے عدل کہا جائے گا اور انسان کی اس صفت کو عدالت کہا جائے گا جس کے اثر سے وہ محدود نگاہ' جزئی فکر' شخصی یا ذاتی مفاد سے بالاتر کام کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے واضح کیا ہے کہ یہ بھی فرشتوں

کی اہم صفت ہے۔ وہ جو بھی کام کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت عالم کی اصلاح' انسانوں کی مجموعی بھلائی' ہمہ جہت خوبی' دور نگاہی اور آفاقی سوچ کے تقاضوں کے مطابق کرتے ہیں۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے ان کے اعمال اللہ تعالیٰ کی تسبیح (نقائص سے پاک ہونے)' تحمید (تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہونے) اور تقدیس (پاکیزگی) کو بیان اور ثابت کرتے ہیں۔ سورۃ المؤمن میں ان کے پیش نظر کاموں اور مقاصد کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ۞ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۞ وَقِهِمُ السَّیِّاٰتِ ؕ وَمَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۞﴾ (المؤمن:۷۔۹)

''وہ (فرشتے) جو عرش اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے لئے استغفار (خطاؤں کی پردہ پوشی کی دعا) کرتے ہیں' (کہتے ہیں) اے ہمارے رب! تو گھیرے ہوئے ہے ہر شے کو (اپنی) رحمت اور علم سے۔ پس بخش دے انہیں جنہوں نے (کفر سے) توبہ کی ہے اور پیروی کی ہے تیرے راستہ کی اور انہیں جہنم کے عذاب سے بچالے۔ اور ان کو ہمیشگی کے باغات میں داخل کر جن کا تُو نے ان سے وعدہ کیا ہے' اور ان کے آباء' ان کی ازواج اور ذریات میں سے جو سدھر جائیں ان کو بھی (ان میں داخل کر)۔ بیشک تو ہی غالب اور حکمت والا ہے۔ اور ان کو (قیامت کے دن کی) تکالیف سے محفوظ فرما۔ بیشک جس کو تو نے (قیامت کے دن کی) تکالیف سے محفوظ فرما دیا تو یقیناً تو نے اس پر رحم فرمایا' اور یہی شاندار کامیابی ہے۔''

فرشتوں کی صفات سے جو انسان جتنی زیادہ مشابہت پیدا کر لیتے ہیں اتنا ہی زیادہ وہ نظامِ عالم کی اصلاح' قوموں' ملکوں اور انسانوں کی مجموعی بہتری کے لئے

کوشاں ہوتے ہیں۔ مگر فرشتوں کے ساتھ حقیقی مشابہت پیدا کر لینے والے انسانوں کے صرف دُنیوی معاملات کی بہتری کی کوشش تک اپنی جدوجہد کو محدود نہیں رکھتے بلکہ وہ ان کی اصل شاندار کامیابی یعنی آخرت کی کامیابی کو اپنا اصل مقصود بناتے ہیں اور ان کے اندر یہ صفت عدالت پوری طرح جلوہ نما ہوتی ہے۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کی شریعت اور ان کی تعلیمات کا اصل مقصود انسانوں کے اندر انہی چار صفات کی تخلیق و تربیت ہے۔

دنیا کے اندر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہر زمانے میں اور ہر ملک و قوم میں وہی انسان عزت و شہرت کے مقام نیز سرداری، قیادت اور حکومت و اقتدار کے مرتبے تک پہنچتے ہیں جن کے اندر یہ مَلکوتی اوصاف دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں طور پر موجود ہوں۔ چنانچہ اصحابِ علم و دانش معلم کے مرتبے پر اور صنعت و حرفت اور سائنسی ایجادات میں عمریں کھپا دینے والے عملی رہنمائی کے درجے پر فائز ہوتے ہیں۔ انسانی معاشرے کی اجتماعی اصلاح کی کوشش کرنے والے، ظلم و ناانصافی کے خلاف لڑنے والے، مظلوموں کی مدد کے لئے اٹھنے والے اور اصلاحی تحریکوں میں اپنا سب کچھ لٹا دینے اور جان و مال کی ہر بازی کھیل جانے والے اپنی اپنی قوموں کی آنکھ کا تارا بنتے ہیں۔ البتہ انبیاء علیہم السلام کی سچی تعلیمات سے بے بہرہ یا اس سے مُنہ موڑنے والے چونکہ ''اِخبات'' کی صفت سے بہرحال محروم رہتے ہیں اس لئے دنیا میں بھی ان کو وہ برکتیں نصیب نہیں ہوتیں جو صفتِ ''اِخبات'' رکھنے والوں کو حاصل ہوتی ہیں اور آخرت میں تو وہ اللہ کی رحمت سے بالکل محروم رہتے ہیں۔ لیکن جو لوگ انبیاء کے طریقے پر چل کر ان چاروں اوصاف کو اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں ان کو دنیا میں بھی اس حد تک بھرپور اجر ملتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ مادی اسباب و قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے مل سکتا ہے اور آخرت کی ''فوزِ عظیم'' تو بس انہی کا حصّہ ہے۔

ہماری اس بات کو اس طرح سمجھ لیجئے کہ اگر چاروں مَلکوتی صفات رکھنے والے ان کم سے کم مادی اسباب کو بھی فراہم کر لیں جو دُنیوی کامیابی کے لئے ضروری ہیں

(یعنی قرآنی معیار کے مطابق قوی الایمان باطل کے مقابلے میں دسواں حصہ جبکہ نسبتاً ضعیف الایمان اپنے سے دوگنا باطل کے مقابل) تو دنیوی کامیابی بھی ان کے قدم چومے گی۔ لیکن مادی اسباب اگر فراہم نہ ہوسکیں یا کم فراہم ہوں تو ہر موقع پر اہل ایمان کی کامیابی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی' کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے ہر معرکہ حق و باطل میں مداخلت فرمائے اور ہر صورت میں اپنی قدرت سے انہیں کامیاب کردے تو عالم اسباب پر انسانوں کا اعتماد ختم ہو جائے گا' جس کا نتیجہ لازماً یہ ہو گا کہ انسان ہر قسم کی جدوجہد چھوڑ کر ہر وقت پردۂ غیب سے ظاہر ہونے والے دست قدرت کی مداخلت کا انتظار کرنے لگے گا۔ اگرچہ عالم کے بہت وسیع تر مفاد کے لئے شاذ و نادر عالم اسباب میں اللہ تعالیٰ کی مداخلت کا مشاہدہ بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آگ کے شعلے خوشگوار اور سلامتی کے ضامن بن جاتے ہیں اور مٹھی بھر خاک پورے لشکر کی آنکھیں چندھیا کر رکھ دیتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس قسم کی مداخلت کے لئے بھی بالعموم عالم اسباب کا ظاہری پردہ برقرار رکھتا ہے ——— جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے صحت بخش چشمہ زمین سے اُس وقت نمودار ہوا جب انہوں نے زمین پر اپنا پاؤں مارا' بنی اسرائیل کے لئے بارہ چشمے اُس وقت پھوٹ نکلے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر اپنی لاٹھی سے ضرب لگائی۔ حضرت مریم کو تازہ کھجوریں حاصل کرنے کے لئے کھجور کے تنے کو ہلانا پڑا اور لشکر کا راشن ختم ہونے پر ہر شخص نے اپنا بچا بچایا توشہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لاکر حاضر کر دیا تب یہ جمع شدہ کھانا پورے لشکر کے لئے کافی ہو گیا۔

شاہ صاحبؒ نے اس مبحث میں ایک اور اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ کچھ اعمال بہیمیت کو تقویت دینے یا آرام پہنچانے والے ہوتے ہیں اور کچھ اعمال بہیمیت کے لئے موجب تکلیف ہوتے ہیں۔ مَلَکیت کا بھی یہی معاملہ ہے۔ تاہم بہیمیت لذت ہو یا الم' راحت ہو یا دکھ' ہر ایک چیز کا فوراً احساس کر لیتی ہے۔ چنانچہ انسان کا پاؤں اگر آگ کی چنگاری پر جا پڑے تو روح حیوانی کو اس کا فوری طور پر ادراک ہو جاتا ہے اور اس

تکلیف سے بچنے کے لئے وہ مناسب احکام صادر کرتی ہے۔ اسی طرح اگر برف کی ڈلی ہاتھ میں آ جائے تو روحِ حیوانی اس کا اِدراک کرتے ہی مثلاً یہ ہدایت دیتی ہے کہ اس برف سے پانی ٹھنڈا کیا جائے۔ اس کے برخلاف روحِ مَلکوتی کے لئے جو باتیں موجب لذت ہوتی ہیں یا جو اعمال موجبِ الم ہوتے ہیں فوری طور پر اُن کا اثر دنیا میں ظاہر نہیں ہوتا' کیونکہ روحِ مَلکوتی بہیمیت کے لبادے یا خول میں ہونے کی وجہ سے ایک طرح سے سن اور وقتی طور پر بے حس ہو جاتی ہے۔ مگر جب بہیمیت کو کمزور کر دیا جاتا ہے یا جب موت کے بعد بہیمیت کا لبادہ یکسر اتر جاتا ہے تب مَلکیت کو پوری شدت کے ساتھ اس لذت یا اَلم کا اِدراک ہوتا ہے۔ چنانچہ عالمِ آخرت میں انسان کے اچھے اعمال حسین باغات اور دودھ یا شہد کی نہروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اس کے برے اعمال جہنم کی آگ' زقوم کا درخت اور کھولتا ہوا پانی بن کر بدکار کی مَلکیت کے لئے عذاب کا سامان بن جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیثِ قدسی میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد اس طرح بیان ہوا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے:

((یَا عِبَادِیْ اِنَّمَا ھِیَ اَعْمَالُکُمْ اُحْصِیْھَا لَکُمْ)) (صحیح مسلم)

''اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال تو ہیں جو میں نے تمہارے لئے گن گن کر رکھے تھے۔''

اسی طرح سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے کہ اہل جنت کو جب بھی جنت کا کوئی میوہ عطا ہوگا تو وہ پکار اٹھیں گے ﴿ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ ''یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے ہی سے دیا گیا تھا'' (یعنی اس پھل کی لذت تو وہی ہے جو اس نیکی کی لذت تھی جس کی توفیق ہم کو دنیا میں ملی تھی)۔ واللہ اعلم!

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

فکر اسلامی کا عظیم سرمایہ (۲)

ایک مطالعاتی جائزہ

تحریر: محمد موسیٰ بھٹو

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کی تصانیف سے مزید اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

انبیاء کی تعلیمات کا ماحاصل

اگر پوچھا جائے کہ ان لاتعداد انبیاء کی تعلیم کا ماحاصل یا روح یا نچوڑ کیا تھا' تو ہم ایک لفظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ''محبت'' —— اسلام محبت کی تعلیم دیتا ہے —— ایسی محبت کی تعلیم جو خالص' بے لاگ اور بے غرض ہو' جو دائمی اور لازوال ہو' جو اپنے کمال کی طرف ہمیشہ بڑھتی رہے اور جس میں کمی یا مایوسی کا قطعاً کوئی امکان موجود نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ قدرت کو اس تکلف کی ضرورت کیا تھی؟ اس نے کیوں انسان کو اپنے حال پر نہ چھوڑ دیا اور کیوں پے در پے انبیاء بھیجے' تا کہ انسان کو ایک خالص' کامل اور لازوال محبت کی تعلیم دیں؟ اس کی وجہ نہایت معقول ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت اس قسم کی محبت کی پیاسی ہے۔ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ اس قسم کی محبت کے لئے بے قرار ہے' تڑپ رہا ہے۔ وہ ہر آن اور ہر لحہ اس قسم کی محبت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس نے اپنی ساری زندگی اسی کی تلاش کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ وہ اس کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا ہے' بڑی ہلاکت خیز مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے' جان پر کھیل جاتا ہے' لیکن اس کی تلاش نہیں چھوڑتا —— کیونکہ چھوڑ ہی نہیں سکتا' یہ محبت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک ایسے محبوب کی تلاش کرے جو اس کی فطرت کے تقاضائے محبت کو بتمام و کمال پورا کر سکے' جسے وہ دل و جان سے چاہے اور جس سے الفت کرے۔

پہلے انسان سے لے کر آج تک نوعِ بشر کی ساری تاریخ اسی محبوب کی تلاش کی ایک طویل داستان ہے' جس کے اکثر باب گوخونچکاں اور دلفگار ہیں' لیکن بعض بعض دل افروز اور دل نواز بھی ہیں۔ خدا کے انبیاء اس لئے آئے' تا کہ انسان کو بتائیں کہ وہ جس محبوب کو چاہتا ہے وہ کون ہے اور اس سے محبت کرنے اور اس کی محبت اور رضامندی حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ گویا دین اسلام' دین قیم یا انبیاء کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس کی دائمی اور غیر مبدل فطرت کے تقاضوں کا صحیح علم بہم پہنچایا جائے' تا کہ اس علم کی مدد سے وہ ان کو باحسن طریق پورا کر سکے۔

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ﴾ (الروم: ۳۰)

''اپنا رُخ خالص دینِ اسلام کی طرف کر لو۔ یہ اللہ کی فطرت ہے' جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی دین قیم ہے''۔

ایک حدیث میں ہے:

((مَامِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ)) (متفق علیہ)

''ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے' پھر اس کے والدین اسے یہودی' نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں''۔ (روحِ اسلام' صفحہ ۸)

حق تعالیٰ کی صفتِ محبت کو قرآن نے رحمت کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے:

﴿كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام: ۱۲)

''اس نے اپنے آپ پر محبت کو فرض کر لیا ہے''۔

﴿رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ﴾ (الاعراف: ۱۵۶)

''میری محبت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے لئے ''الرحمٰن'' کا نام پسند کرتا ہے' جس کے معنی ہیں عام رحمت کرنے والا۔ خدا کی محبت انسان کے لئے ہے اور وہ توقع رکھتا ہے کہ انسان بھی اس سے محبت کرے۔ اس نے انسان کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ اس کی اپنی صفات کی

طرح انسان کی صفات کا مرکز بھی محبت ہی کو بنایا ہے۔ اس محبت کی صفت کی وجہ سے انسان خدا کی باقی صفات سے' جو محبت کی مؤید اور معاون ہیں' حصہ لیتا ہے۔ حدیث کے الفاظ: ''اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ'' کا مطلب یہی ہے۔

اپنی فطرت کے اندر صفاتِ ربانی کا پَرتو رکھنے کی وجہ سے ہی انسان خدا کا خلیفہ قرار پایا ہے۔ انسان کا فطرتی جذبۂ محبت صرف خدا کی محبت اور عبادت سے مطمئن ہوتا ہے اور خدا کی عبادت کا مقصد یہ ہے کہ انسان جس حد تک کہ اس کے لئے ممکن ہو' اپنے آپ کو خدا کے اوصاف کے ساتھ متصف اور اس کے اخلاق کے ساتھ متخلق کرے۔ اس راہ میں وہ جس قدر زیادہ ترقی کرے گا اسی قدر خدا کی محبت اور نیابت کا اہل ہوگا۔ (روحِ اسلام' صفحہ ۱۸)

مُحبّت کے نصب العین کی کامل تعلیم کے لئے خدا کی طرف سے نبوت کا اہتمام

اگر تمام پیغمبروں کی تعلیمات کا خلاصہ صرف ایک لفظ میں بیان کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو وہ لفظ ''محبت'' ہے۔ اسلام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ محبت کریں اور اپنی محبت کو جس قدر زیادہ پاکیزہ' یکسو' خالص' بے لوث اور صمیم قلب سے صادر ہونے والی بنا سکتے ہیں بنائیں اور پھر اُن کی محبت ایسی ہو کہ وہ ہمیشہ عظیم سے عظیم تر' کمالِ پاکیزگی اور خلوص کی جانب بڑھتی رہے اور اس میں ایک لمحہ کے لئے بھی کسی کمی' کمزوری یا مایوسی کے آثار پیدا نہ ہوں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبوت کا ظہور درحقیقت کارخانۂ قدرت میں کسی مقصد کو پورا کرتا ہے؟ کیا انسان کو واقعی اس بات کی ضرورت ہے کہ اسے کامل' دائمی اور مخلصانہ محبت کی تربیت اور ترقی کا وہ طریقہ سکھایا جائے جس کی تعلیم انبیاء دیتے چلے آئے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک کامل' پائیدار اور مخلصانہ محبت جو ایک نصب العین کے حصول کی والہانہ شکل اختیار کرتی ہے' انسان کی تمام فطری خواہشات میں سب سے زیادہ طاقتور ہے اور سب خواہشات پر غالب آنے والی خواہش ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ خواہش چونکہ انسان کی تمام دوسری خواہشات کو اپنے تابع رکھتی ہے' بلکہ یوں کہنا

چاہئے کہ وہ دراصل اس کی فطرت کی ایک ہی خواہش ہے اور انسان اسی خواہش سے عبارت ہے اور نبوت کی اہمیت یہ ہے کہ صرف وہی انسان کی اس خواہش کی صحیح، مکمل اور مستقل تشفی کا ذریعہ ہے' لہٰذا نبوت کا عالمِ فطرت میں ایک خاص مقصد ہی نہیں' بلکہ وہ کارخانۂ قدرت کے نظم ونسق کو چلانے کے لئے ناگزیر ہے۔ (منشور اسلام' صفحہ ۱۵)

نصب العین کی خواہش کی انسان کی نفسیاتی اور جمالیاتی خواہشات پر ہی نہیں' بلکہ اس کی جبلتی خواہشات پر بھی حکمرانی ہے۔ ایک حیوان کے لئے ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی کسی جبلتی خواہش کے دباؤ کو روک سکے۔ اس کے برعکس انسان اپنی کسی جبلتی خواہش کی تشفی اس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کا نصب العین اجازت نہ دے اور وہ اپنی ہر جبلتی خواہش کی تشفی صرف اس حد تک کرتا ہے جس حد تک اس کا نصب العین اجازت دیتا ہو۔ جب ایک انسان کا نصب العین یہ تقاضا کرتا ہو کہ وہ اپنی زندگی کو قائم رکھے' تو وہ اس کو قائم رکھنے کے لئے اپنی جبلتی خواہشات کی مناسب تشفی کے لئے پوری کوشش کرتا ہے' لیکن جب نصب العین کا تقاضا یہ ہو کہ انسان اپنی زندگی کو اس کی حفاظت کے لئے قربان کر کے شہید ہو جائے تو وہ جبلتی خواہشات کی تشفی سے ہی نہیں بلکہ خود زندگی سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور اسے قربان کرنے کے لئے بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو ان لاتعداد واقعات کی تشریح کرتی ہے جو ہر روز ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنے نصب العین کی خاطر یہ جانتے ہوئے زندان میں جانا قبول کرلیا ہے کہ وہاں اسے اپنی جبلتی ضروریات کو روکنا یا ترک کرنا پڑے گا یا اسے سخت قسم کی بدنی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرنے کے سوائے چارہ نہ ہوگا یا فلاں شخص نے نصب العین کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا ہے یا دار پر چڑھنا یا میدانِ جنگ میں گولی کھا کر مرجانا قبول کرلیا ہے۔

اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ انسان بالآخر اور درحقیقت صرف ایک ہی خواہش رکھتا ہے اور وہ کسی نصب العین کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کی باقی ماندہ تمام نفسیاتی یا جبلتی خواہشات اس ایک خواہش کے تابع اور اس کی خدمت گزار ہوتی ہیں۔

یہی ایک خواہش اس کے تمام اعمال وافعال کی اصلی اور بنیادی قوتِ محرکہ ہوتی ہے اور اس کی فطرت کی کوئی اور قوت اس کے کسی عمل یا فعل کو پیدا نہیں کرتی۔ یہی خواہش فطرتِ انسانی کا وہ طاقتور اور زبردست جذبۂ عمل ہے جس کو فرائڈ نے غلطی سے جنسی محبت کا جذبہ سمجھا ہے' جسے ایڈلر نے نادانی سے قوت یا غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کا جذبہ قرار دیا ہے' جس پر میکڈوگل کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ وہ انسان کی جبلتی یا حیوانی خواہش کے ایک پُر اسرار مرکب کا جذبہ ہے اور جسے کارل مارکس نے بلا دلیل یہ فرض کرلیا ہے کہ وہ انسان کی اقتصادی ضروریات کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ (منشورِ اسلام' صفحہ ۹)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان جس نصب العین کی جستجو کر رہا ہے وہ اس کے اندرونی فی الواقع کون سے اوصاف کی موجودگی کی توقع کرتا ہے' اس سوال کا جواب نصب العین کے لئے انسان کی فطری خواہش کی نوعیت کے اندر پہلے ہی سے موجود ہے' کیونکہ یہ خواہش حسن کے لئے ہے' وہ صرف ایک ایسے نصب العین سے ہی مطمئن ہوسکتی ہے جو منتہائے حسن وکمال ہو۔ یعنی:

(۱) جو ہر اُس نقص وعیب سے پاک ہو جس کا ہم انسان ہونے کی حیثیت سے تصور کرسکتے ہیں ——— اور

(۲) جس میں وہ تمام اوصاف بدرجۂ کمال موجود ہوں جن کو ہم اپنی فطرت کے تقاضوں کی بنا پر عمدہ' حسین اور قابلِ ستائش اور لائقِ محبت سمجھتے ہیں۔

نقص یا عیب محبت کا دشمن ہے' لہٰذا جونہی انسان کو اپنے نصبُ العین کے اندر کسی چھوٹے سے چھوٹے نقص کی موجودگی کا یا کسی چھوٹی خوبی کی عدم موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے تو اس کی محبت کافور ہو جاتی ہے' بلکہ نفرت میں بدل جاتی ہے۔ بے شک ایک انسان ایک زشتِ ناقص یا گھٹیا نصب العین سے بھی محبت کرسکتا ہے اور کرتا ہے' لیکن صرف اس وقت تک جب تک کہ وہ اس کی طرف غلطی سے حسن اور کمال کے وہ تمام اوصاف منسوب کرسکے جن کا وہ تصور کرسکتا ہے اور اپنے آپ کو دھوکہ دے سکے کہ یہ اوصاف درحقیقت اس کے اندر موجود ہیں۔ (منشورِ اسلام' صفحہ ۲۱)

باطل نصب العین کی طرف حسن و کمال کی صفات منسوب کرنے کی انسانی روش

انسان کے نصب العین کی محولہ بالا دو عمومی اور بنیادی صفات کے اندر اور بہت سی صفات مضمر ہیں، جن کا ہم اسی طرح ان صفات سے استخراج کر سکتے ہیں۔ چونکہ انسان کی فطرت کی رُو سے یہی وہ صفات ہیں جو انسان اپنے نصب العین کے اندر موجود دیکھنا چاہتا ہے، لہٰذا خواہ اس کا نصب العین کچھ ہو، ایک پتھر ہو، یا ایک درخت ہو، یا دریا ہو، یا پہاڑ ہو، یا ایک بُت ہو، یا قوم، یا نسل، یا وطن، یا ایک نظریہ یا ازم، وہ ان صفات کو اپنے نصب العین کی طرف ہر حالت میں منسوب کرتا ہے۔ بعض کو شعوری اور دانستہ طور پر اور بعض کو غیر شعوری اور نادانستہ طور پر۔ مثلاً خواہ انسان کا نصب العین کوئی مادی چیز ہو یا کوئی تصور، اس کا چاہنے والا اس کے ساتھ اس طرح سے برتاؤ کرتا ہے کہ گویا وہ ایک شخصیت ہے، جس میں زندگی، قوت، حسن، نیکی اور صداقت کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جو اس کے لئے ممکن بناتی ہے کہ وہ اس سے محبت کرے اور اس کی ستائش اور پرستش کرے اور اس کی خدمت کے لئے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائے۔ (منشورِ اسلام، صفحہ ۲۵)

اب غور فرمایئے کہ ایک طرف سے تو انسان کے اندر ایک ایسے نصب العین کی محبت کا زبردست جذبہ موجود ہے جو خالقِ کائنات ہو اور بدرجۂ کمال حُسن، نیکی، صداقت اور قوت کی صفات کا مالک ہو اور دوسری طرف سے کائنات کی کوئی تشریح اس سے زیادہ قابلِ یقین اور حقائقِ معلومہ اور مسلّمہ کے مطابق نہیں کہ کائنات کی حقیقت ایک ایسا وجود ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور جو بدرجۂ کمال حُسن، نیکی، صداقت اور قوت کی صفات کا مالک ہے۔ اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ وہ نصب العین جسے نوعِ انسانی تاریخ کی کٹھن منزلوں میں تلاش کر رہی ہے (یعنی انسان کا صحیح نصب العین) خود حقیقتِ کائنات کے سوائے اور کوئی نہیں۔ یہ ہے وہ ناقابلِ انکار اور عظیم الشان صداقت جسے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں اور جس پر وہ زور دیتے ہیں۔ ہر نبی جو دنیا میں آیا، اس کی دعوت کی ابتداء اور انتہا یہ تھی کہ اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے

کہا: لا الٰہ الا اللہ۔ خدا کے سوائے کوئی معبود نہیں' جو (اپنی صفات کی بناء پر) تمہاری محبت' ستائش' پرستش اور خدمت کا حق دار ہو۔

خاتم الانبیاء ﷺ نے اعلان فرمایا تھا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (البقرۃ:۲۱)

''اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی پیدا کیا تھا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں''۔ (ایضاً صفحہ ۲۶)

تعلیمِ نبوت سے بے نیازی کی وجہ سے شخصیت کا غلط نصب العین کی راہ اختیار کرنا

تعلیمِ نبوت کی مطلق اہمیت اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ نصب العین کے لئے انسان کی آرزو نہ دبائی جا سکتی ہے اور نہ روکی جا سکتی ہے۔ جب ایک انسان اپنی حماقت یا بے پروائی کی وجہ سے نبوت کی راہ نمائی سے مستفید نہیں ہوتا اور صحیح نصب العین کی محبت سے محروم رہ جاتا ہے تو پھر ایسا نہیں ہوتا کہ نصب العین کے لئے اس کی محبت کا جذبہ رک جائے یا دب کر ختم ہو جائے' بلکہ وہ ایک غلط نصب العین کی راہ سے اپنا اظہار پانے لگتا ہے۔ اور جب ایک انسان اس طرح ایک غلط نصب العین سے محبت کرنے لگ جائے تو وہ بعد میں اس خطرناک اور بے بنیاد محبت کے شدید نقصانات کا سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک انسان جو اچھی اور صحت بخش غذا نہ پا سکے' اپنی بھوک کو روک نہیں سکتا' بلکہ جو غذا بھی اسے مل جائے' خواہ وہ کیسی ہی مضرِ صحت اور خطرناک ہو' اسی سے اپنا پیٹ بھرنے پر مجبور ہوتا ہے' لیکن بعد میں اس غذا کے شدید نقصانات کا سامنا کرنے سے بچ نہیں سکتا۔ (ایضاً)

نصب العین کی محبت معلومات سے پیدا نہیں ہوتی

محض یہ سن لینا یا اطلاع رکھنا کہ فلاں نصب العین حسین ہے' کسی انسان کے دل میں اس نصب العین کی محبت پیدا نہیں کر سکتا۔ ایک نصب العین کی محبت صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اس کے حسن کو فی الواقع محسوس کیا جائے۔ ضروری

ہے کہ ایک دریا جس کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کر دی گئی ہو اپنا راستہ بدلے اور زمین کی اس سطح پر بہنا شروع کر دے جو اس کے پانی کو اپنی خاص بلندی کی وجہ سے قبول کر سکتی ہو خواہ اس کے نتائج کھیتوں اور انسانی آبادیوں کے لئے کچھ ہوں۔ اسی طرح سے جو انسان اپنے صحیح نصب العین کے حسن کو محسوس نہ کر سکے' ضروری ہے کہ اس کے جذبۂ حسن کا زوردار بہاؤ اپنا فطری راستہ بدل لے اور ایک ایسے تصورِ حسن کی راہ سے اپنا اظہار پانے لگ جائے جو حسین تو نہیں' لیکن جس کا فرضی حسن وہ اپنی نادانی اور علمی بے مائیگی کی وجہ سے اس طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سے بیاباں میں ایک پیاسا سراب کو پانی سمجھتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں وہ اسے غلطی سے صحیح نصب العین یعنی خدا سمجھ لیتا ہے اور لہٰذا اسے دل و جان سے چاہنے لگتا ہے اور اس سے ویسی ہی محبت کرتا ہے' اس کی ویسی ہی خدمت کرتا ہے' ویسی ہی ستائش کرتا ہے اور ویسی ہی پرستش کرتا ہے جیسی کہ اللہ کے لئے ہونی چاہئے۔ قرآن حکیم نے انسان کی فطرت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۶۵)

''لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو خدا کو چھوڑ کر اوروں کو معبود بنا لیتے ہیں اور پھر اُن سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہئے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں' خدا سے شدید محبت رکھتے ہیں''۔ (ایضاً' ص ۲۹' ۳۰)

ذکر و فکر اور عبادت شخصیت کے ارتقاء کو نکتۂ کمال تک پہنچانے کا ذریعہ ہے

انسان کا وہ عمل جسے خدا کی عبادت کا نام دیا جاتا ہے اور جس کا بڑا عنصر ذکر ہے' انسان کے تجربات میں سب سے زیادہ قیمتی اور اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس کے ذریعہ سے انسان اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی آرزو کو اپنا صحیح اور قدرتی اظہار پانے کا موقع دیتا ہے اور اس طریق سے اس کی مکمل اور مستقل تشفی کر کے اپنی شخصیت کے ارتقاء کو نکتۂ کمال پر پہنچانے کا

اہتمام کرتا ہے۔ یہ گویا انسانی خودی کا اپنے مبدأ کی طرف عود اور اپنی منزلِ مقصود کی طرف رجوع ہے۔ یہ دو بچھڑے ہوئے عاشقوں کی ملاقات ہے جو کروڑ ہا برس کے ارتقائی عمل کی صورت اختیار کرنے والی ایک دوسرے کی طویل جستجو کے بعد اُن کو میسر آتی ہے۔ اقبال ہمیں بتاتا ہے کہ عبادت ایک فطری عمل ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے سائنس دانوں کی جستجوئے صداقت کا ہی ایک تتمہ ہے۔

عبادت کا منبع انسان کی فطرت میں ہے۔ فکر کے ذریعہ سے شعور حقیقت کے عمل کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ ذکر کے دوران یہ سست رفتاری سے منکشف ہونے والے عالمگیری اصولوں کی جستجو کی قوت کی حیثیت سے اپنا کام ترک کر دیتا ہے اور فکر سے بالا ہو کر براہِ راست حقیقت کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے' تا کہ اس کے کام میں ارادی طور پر شرکت کر سکے۔ اس میں کوئی مخفی یا ناقابلِ فہم بات نہیں۔ عبادت حصولِ تجلی کے ایک ذریعہ کے طور پر ایک قدرتی حیاتیاتی فعل ہے جس سے ہماری شخصیت کا چھوٹا سا جزیرہ اچانک ہی زندگی کی بڑی وحدت میں اپنا مقام دریافت کر لیتا ہے۔ دراصل عبادت کو قدرت کا مشاہدہ کرنے والے انسان کی جستجوئے علم کا ایک ضروری تتمہ سمجھنا چاہئے۔ قدرت کا سائنسی مشاہدہ حقیقت کے کردار کے ساتھ ہماری گہری وابستگی قائم کرتا ہے اور اس طرح سے اس کے زیادہ گہرے مطالعہ کے لئے ہمارے وجدان کو تیز تر کرتا ہے..... سچ بات یہ ہے کہ علم کی ساری جستجو ہی دراصل ایک قسم کی عبادت ہے اور قدرت کا مشاہدہ کرنے والا سائنسدان ایک قسم کا جویائے حق صوفی ہے' جو عبادت کر رہا ہے۔ (حکمتِ اقبال' صفحہ ۲۵۹)

حقیقت کے سارے علم کا انسان کے اندر موجزن ہونا اور فطرت کا اسے صرف جگانے کا کام سرانجام دینا

دہریت اگر کہیں ہے تو محض زبانوں پر ہے' انسانوں کے دلوں پر اس کا کہیں قبضہ نہیں ہوا۔ تصورِ خالق رکھنے کا سبب اپنے ماحول سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نہیں' اور یہ

محض خارجی نہیں، بلکہ داخلی بھی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے، ہماری فطرت میں کسی عظیم و جمیل ہستی کی آرزو خوابیدہ ہے، جسے ہمارا شعور تلاش کر رہا ہے۔ چنانچہ اس طرح خارجی فطرت کی علامت اور داخلی آرزو دونوں باہمی تعلق قائم کرتی ہیں اور ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں۔ اس تعلق و تقویت کا ہمیں جتنا زیادہ علم ہوتا ہے اتنا ہی ہم اس دنیا میں آرام و سکون محسوس کرتے ہیں اور اپنی حقیقت سے باخبر ہو جانے کی وجہ سے ہمیں اتنی ہی راحت و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ درحقیقت ہمارا خالق کو ماننا خارجی کی نسبت داخلی زیادہ ہے۔ ایک کامل ہستی کی آرزو کے بغیر ہم کبھی فطرت کی تعریف کرنے یا اس پر غور و فکر کر کے خالق کا تصور پیدا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے تھے۔ حقیقت کا تمام علم خود ہمارے اندر ہے، فطرت اسے صرف جگا دیتی ہے۔ پھر اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو یہ اپنے آپ میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ شعورِ ایزدی کا ہر علم جو ہمیں حاصل ہوتا ہے، فوراً ہمارے شعور کا علم بھی ہوتا ہے۔ خالق پر ایمان لانا اپنے آپ پر ایمان لانا ہے۔ (ماہنامہ اسلامی تعلیم، مئی جون ۱۹۷۳ء، مضمون بعنوان ''وجدان اور عبادت'')

احساس علم کی اعلیٰ ترین قسم ہے جس کے زیرِ اثر زندگی کی راہیں تراشی جاتی ہیں، حسن کا علم صرف احساس کے ذریعہ ہونا

''شعورِ انسانی کی طرح شعورِ ایزدی کے متعلق بھی ہمارا تمام علم سائنسی ہے نہ عقلی۔ یہ دونوں لفظ حقیقت کے مروّج علوم میں استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کی نوعیت کچھ احساس، حساسیت، وجدان، ایمان یا عینی مشاہدہ کی سی ہے۔ احساس صرف علم ہی نہیں، بلکہ علم کی اعلیٰ ترین قسم بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل احساس کو تیز تر کر دیتی ہے، لیکن احساس محض عقل کی نسبت بہت کچھ زیادہ جانتا ہے۔ عقل کسی شے کا محض ایک جزو سمجھ سکتی ہے لیکن احساس کُل پر حاوی ہوتا ہے۔ اس بات کا اندازہ بہت کم لگایا جاتا ہے کہ یہ علم جس کے زیر اثر ہم اپنی زندگی کی راہیں تراشتے ہیں، کبھی خالص منطقی،

علمی یا ذہنی نہیں ہوتا' یہ ایک احساس کی نوعیت ہوتی ہے' تاہم ذہانت ہی اس کی کم وبیش رہنمائی کرتی ہے۔ ہم وہی کچھ کرتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں اور یہ ہرگز نہیں دیکھتے کہ مدلل' معقول یا ریاضیاتی طور پر صحیح کیا ہے؟ ہماری زندگی کا رہنما اصول محبت ہے' منطق نہیں' اور جیسا کہ ہم دیکھ سکتے ہیں' انسانی زندگی کا داعیہ محبت یا احساسِ حسن ہے' ذہانت داعیہ نہیں بن سکتی' کیونکہ یہ نہ حُسن کا علم رکھ سکتی ہے' نہ احساس کر سکتی ہے۔ ایک سائنس دان ہمیں یہ تو بتا سکتا ہے کہ آواز کس طرح پیدا ہوتی ہے' لیکن یہ نہیں بتا سکتا کہ نغمہ شیریں اور حسین کیوں ہے۔ وہ تصویر کا احاطہ اور رقبہ ٹھیک ٹھیک ماپ کر بتا سکتا ہے۔ وہ یہ بتا سکتا ہے کہ روشنی کی شعاعوں کا کیا حصّہ ہے اور آنکھ کا پردہ' اعصابِ بصارت یا دماغ اسے دیکھنے میں کہاں تک مدد کرتے ہیں۔ وہ اس میں مستعمل رنگوں میں جزئیات تک بیان کر سکتا ہے' لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ تصویر کا حسن کس شے پر مشتمل ہے۔ وہ فوراً اس کے حسن سے متاثر ہو سکتا ہے' لیکن وہ منطقی یا علمی طور پر اس کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ حسن کا علم صرف احساس کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے' یہ عقلیت کی دسترس سے باہر ہے۔ (ایضاً)

راستہ کا اہم حصّہ احساس کی رفاقت میں طے ہونا

احساس مجموعی نفس کا فعل ہے' ذہانت اس کا ایک حصّہ ہے۔ نفس کُل کو دیکھتا ہے' لیکن ذہانت کی نظر محض ایک جزو پر ہوتی ہے۔ حال ہی میں نفسیات کے مدرسہ گشٹالٹ نے کُل' تمام' یا کلیت پر زور دیا ہے' جو محض عینی مشاہدہ یا حساسیت کی بدولت جانی جا سکتی ہے۔ ایک تصویر یا ایک نغمہ کُل ہے' جو اپنے اجزاء کے مجموعے سے بھی بہت بڑا ہے اور عقل کی قلمرو صرف اجزاء تک محدود ہے۔

کوئی شک نہیں کہ وجدان بھی غلطی کرتا ہے' لیکن اس سے اس کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بالآخر یہ وجدان ہی ہے جو غلطی کا مرتکب نہیں ہوتا اور اس علم کی حدود تک پہنچ سکتا ہے جس کے لئے نفس ہمیشہ متقاضی ہوتا ہے۔ نفس حسن کو خواہ وہ غلط ہو یا صحیح' چاہتا اور اس سے محبت کرتا ہے۔ آخر کار ہمیں صرف احساس پر انحصار کرنا پڑتا

ہے۔ عقل کچھ دُور تک ہمارے ساتھ جاتی ہے' لیکن آخری منزلِ مقصود (یعنی نصب العین صحیح ہو یا غلط) صرف احساس کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔

چونکہ عقل اس راہ میں تھوڑی دُور تک ہمارے ساتھ جاتی ہے' اس لئے ہم منزل پر پہنچ کر سادگی سے اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ عقل نے ہمارا ساتھ بہت دیر ہوئی چھوڑ دیا تھا اور یہ کہ ہم نے راستے کا اہم حصّہ احساس کی رفاقت میں طے کیا ہے۔ یہ ایمان' احساس یا وجدان ہی ہے جو فلسفی حتیٰ کہ سائنسدان کو بھی تحریک دیتا ہے کہ وہ تلاشِ حق کے راستے پر گامزن ہو۔ ذہانت وجدان کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے اور اسے ایک خاص سمت میں سرگرم بناتی ہے' لیکن حق کو سب سے پہلے احساس' وجدان یا ایمان کے ذریعے سے ہی محسوس کیا جاتا ہے (خواہ یہ کتنا ہی مبہم کیوں نہ ہو) اور بعد ازاں دریافت کیا جاتا ہے' بلکہ جہاں تک ممکن ہو عقل کے ذریعے اس کا منطقی مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ عقل کے لئے جس شے کا اس طرح مظاہرہ کرنا ممکن ہوتا ہے وہ ہرگز اس شے کے کُل کے برابر نہیں ہوسکتی جس کا ادراک نفس نے بذریعۂ وجدان کیا ہو۔ اس کے برعکس ہم جس علم کو سائنسی اور عقلی قرار دیتے ہیں وہ کبھی کامل طور پر عقلی نہیں ہوتا' بلکہ اس میں ایمان' وجدان اور احساس کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ سائنس کا علم کیوں ہمیشہ بدلتا اور تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اگر فطرت انسان کو ذہانت کے سپرد کردے اور اس سے ایمان واپس لے لے تو انسان کی تمام سرگرمیاں اس کے ہر دائرہ کار میں رک جائیں۔ اگر اپنے دوست کے متعلق میرے علم میں ایمان کا عنصر نہ ہو تو میں نہایت آسانی سے اسے اپنے جیسا انسان سمجھنے کی بجائے ایک کٹھ پتلی سمجھتا۔ (ایضاً)

غلط نصب العینوں میں اُلجھ جانے کی وجہ سے خواہشِ عبادت کا الگ ہو کر آزاد ہو جانا

جب ہم آلام و مصائب میں گھرے ہوتے ہیں تو اس وقت کیوں عبادت کرتے

ہیں؟ عبادت کی خواہش کرنا نفس کی ایک قدرتی خواہش ہے جو وہ اپنے نصب العین کے لئے کرتا ہے' یہ کسی مایوسی یا مصیبت سے پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ہر وقت موجود ہوتی ہے' لیکن غلط نصب العینوں میں الجھی ہوتی ہے۔ جب کبھی یہ غلط نصب العین دھوکا دے جاتے ہیں' جیسا کہ وہ اپنے غیر حقیقی خواص اور ہماری فطرت کے ساتھ ناموزونی کی وجہ سے ضرور کریں گے' تو عبادت کی خواہش ان سے الگ ہو کر آزاد ہو جاتی ہے۔ یوں کہئے کہ ہم نے اسے استعمال کیا تھا یا اسے غلط راہ پر ڈال رکھا تھا اور اب اسے اپنی راہ پر چلنے کا موقع مل گیا ہے۔ مصیبت اس شے سے اس خواہش کے جبراً اور لازماً علیحدہ ہونے کا نام ہے جسے نفس غیر تسلی بخش پاتا ہے' اور وہ سکون و اطمینان جو ہمیں عبادت سے حاصل ہوتا ہے نفس کے اس شے سے دوبارہ وابستہ ہو جانے سے ملتا ہے' جو نفس کے لئے سب سے زیادہ اطمینان بخش ہے اور جسے شعورِ ایزدی کہتے ہیں۔ غور سے دیکھیں تو ہر مصیبت نفس کے لئے احساسِ تنہائی ہے' جو بے وفا ساتھیوں یعنی غلط نصب العینوں سے پیدا ہوتا ہے۔ جب کبھی نفس اپنے رفیقِ اعظیم یعنی شعورِ ایزدی یا صحیح نصب العین سے کٹ کر کسی غلط نصب العین کی صحبت اختیار کر لیتا ہے تو اس کا داعیہ غیر مطمئن رہ جاتا ہے۔ لیکن نفس کو اس بات کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ جھوٹا اور بے وفا ساتھی اسے پہلے ہی چھوڑ چکا ہوتا ہے۔ نفس اس انکشاف کو مصیبت کے نام سے پکارتا ہے اور اسے ناقابلِ برداشت سمجھتا ہے۔ اس مرحلے پر اس کے سامنے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ پھر اپنے اس ساتھی کی طرف رُخ کرے جسے اس نے شروع میں غلطی سے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم مصیبت زدہ اشخاص کو عبادت میں مشغول پاتے ہیں۔ جو شخص رفیقِ حقیقی سے قطع تعلق نہیں کرتا اس کے لئے مصیبت کوئی شے نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کے کئی اور ساتھی بھی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ہر ایک کو مناسب درجہ دیتا ہے۔ ان کے بے وفایانہ کردار کا اسے پہلے سے علم ہوتا ہے' اس لئے جب وہ اس سے غداری کرتے ہیں تو وہ اس واقعہ کو چنداں وقعت نہیں دیتا اور غیر مناسب طور پر مایوس یا غمزدہ نہیں ہوتا۔ (ایضاً)

(جاری ہے)

بائبل کے اختلافات

ترتیب: مولانا مشیر احمد قاسمی دیناج پوری، بھارت

مسیحیت کے ابتدائی دَور میں مروّجہ چار انجیلوں کے علاوہ اور بھی بہت سی انجیلیں موجود تھیں، جنہیں قسطنطین اعظم اور تھیوڈوڈیس بادشاہ نے جلا دینے کا حکم کیا، جس کی بنا پر بہت سی انجیلیں جلا دی گئیں، اسی طرح ''لیون اوّل'' جو ۴۴۰ء سے ۴۶۱ء تک پوپ اعظم کے عہدہ پر رہا، اس نے بھی اس قسم کی متروک اناجیل کو جلا دیا۔ مقدس ''جیروم'' کی کتابوں اور پوپ ''جے لارو'' کے محاکمہ سے بہت سی انجیلوں کا سراغ ملتا ہے۔ ''فیربیس'' نے پچاس متروک انجیلوں کی کیفیت لکھ کر شائع کی، خود لوقا اپنی انجیل کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ:

''چونکہ بہتوں نے کمر باندھی کہ ان کاموں کو جو ہمارے درمیان واقع ہوئے ہیں، ان کو ترتیب وار بیان کریں جیسا کہ انہوں نے جو شروع سے دیکھنے والے اور کلام کے خادم تھے، ہم کو پہنچایا۔''

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ لوقا کی انجیل سے پہلے بہت سی انجیلیں تالیف ہو چکی تھیں۔

جس طرح مسیحیت کے ابتدائی دَور میں بہت سی انجیلیں تھیں اسی طرح حواریوں کی تبلیغی مساعی کے سلسلے میں اعمالِ رسول کے نام سے بہت سی کتابیں تھیں، جیسے یوحنا کے اعمال، لوقا کے اعمال وغیرہ۔ اسی طرح ایک بڑی تعداد ایسے مکتوبات کی بھی تھی جو حواریوں کی طرف منسوب تھے۔ ۴۸۲ء تک منعقد ہونے والی کونسلوں نے ان مکتوبات و اعمال میں سے بعض کو کبھی کتابِ مقدس سے خارج قرار دیا اور پھر کبھی دوسری کونسل میں ان کو کتابِ مقدس میں شامل کر لیا، ادھیڑ بن کا یہ سلسلہ ۴۸۲ء تک چلتا رہا، لیکن

۳۸۲ء میں روم میں جو کونسل منعقد ہوئی اس نے موجودہ عہد جدید کے پورے مجموعہ کو مستند تسلیم کیا' اور پوپ گلاسیوس نے باضابطہ طور پر انہیں سند قبولیت عطا کی' اس کے بعد مسیحی دنیا کے سواد اعظم نے ایک مکمل بائبل پر اتفاق کیا۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ ''بائبل'' کو مستند قرار دینے کی وجہ اس کا الہامی ہونا نہیں ہے' بلکہ مخالفین کے سامنے تعلیماتِ مسیح کے بارے میں زبردستی ثبوت فراہم کرنا ہے' اگر ایسا نہیں ہے تو پھر انجیلوں اور اعمالِ رسول اور حواریوں کے خطوط کے انبار میں سے صرف انجیل متی' مرقس' لوقا' یوحنا اور اعمالِ رسول لوقا' پولس کے چودہ خطوط' یعقوب کا ایک خط' پطرس کے دو خط' یوحنا کے تین خط' یہودا کا ایک خط اور مشاہدات یوحنا کے منتخب کرنے اور ان کو مستند تسلیم کرنے اور بقیہ اناجیل و اعمالِ رسول اور خطوط کو غیر مستند قرار دینے کی کیا وجہ ہے؟ اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی سوائے اس کے کہ دراصل کلیسا اپنے لئے یہ ضروری سمجھتا تھا کہ وہ مخالفین کے سامنے تعلیماتِ مسیح کا ثبوت فراہم کرے اور ثابت کرے کہ یہ تعلیمات و معجزات حضرت مسیح کے ہیں' اسی مدعا پر جب گواہی کی ضرورت پیش آئی تو کلیسا نے مرقس و متی و یوحنا کو اپنے اعتقاد کے موافق اور قریب تر پا کر ان کی انجیلوں کو بھی قبول کر لیا' اور ان تمام انجیلوں کو کلیسا نے متروک قرار دیا جن سے تثلیث کی جڑ کٹتی تھی یا جو موسوی شریعت کی اطاعت کو لازم کہتی تھیں۔ کلیسا کے اس انتخاب میں کتابوں کے مضامین کے الہامی ہونے اور ان کے مؤلفین کے مامور من اللہ ہونے کو کوئی دخل نہیں ہے' اس لئے کہ اگر الہامی ہونے کی بات ہوتی تو ایک انجیل کافی تھی' چند اناجیل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی' اس لئے کہ خدا کا خطاب عام ہوتا ہے' انبیاءِ سابقین پر بھی کوئی کتاب مکرر نازل نہیں ہوئی' ورنہ لازم آئے گا کہ خدا کو ایک مرتبہ الہام کے بعد اطمینان نہیں ہوا تو اس نے پھر دوبارہ الہام کیا۔

''بائبل'' کے الہامی ہونے کی مزید تردید:

موجودہ ''بائبل''، جس کے بارے میں عیسائی لوگ الہامی و آسمانی ہونے کا دعویٰ

کرتے ہیں' وہ اختلافات و تضادات سے اس قدر لبریز ہے کہ خود عیسائی محققین و مفسرین بھی اس کے اختلافات و تضادات کو تسلیم کرنے اور ایک عبارت کو درست اور دوسری کو جعلی اور من گھڑت قرار دینے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ ''انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا'' میں ہے کہ:

''بہت سے مسیحی علماء نے یہ کہا ہے کہ وہ تمام اقوال و احوال جو ''کتب مقدسہ'' (بائبل) میں موجود ہیں سب کے سب الہامی نہیں ہیں اور جو لوگ ''کتب مقدسہ'' (بائبل) کی تمام باتوں کے الہامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے پر قادر نہیں ہیں۔''

دیکھئے جو کتاب خود بعض مسیحی علماء کے نزدیک بالکل الہامی نہیں ہے وہ اوروں کے نزدیک کیسے الہامی ہوسکتی ہے؟ جب کہ اس کے الہامی ہونے کے لئے ایک عظیم مانع بھی موجود ہے' اور وہ ہے بائبل کا اختلافات و تضادات سے غیر محفوظ ہونا۔

''بائبل'' کے اختلافات و تضادات کو حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ نے اپنی کتاب ''اظہار الحق'' میں نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جن کی تعداد ۱۲۴ ہے۔ ہم یہاں پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کی کتاب سے چند اختلافات و تضادات آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ آپ کو یہ معلوم ہو سکے کہ ''بائبل'' میں کس قدر متضاد و متناقض مضامین موجود ہیں' اور پھر اس کے اختلافات و تضادات پر نظر کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ یہ کتاب الہامی و آسمانی نہیں بلکہ جعلی اور من گھڑت باتوں کا مجموعہ ہے۔

خدا کا الہام اختلافات و تضادات سے پاک ہوا کرتا ہے' یہ عیب تو صرف غیر اللہ کے کلام میں پایا جاتا ہے' جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ (النساء:۸۲)

''اور اگر یہ (قرآن) غیر اللہ کے پاس سے نازل ہوتا تو یہ لازماً اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے''۔

واضح رہے کہ آگے جو اختلافات کے نمونے پیش کئے جا رہے ہیں وہ حضرت مولانا

رحمت اللہ کیرانویؒ کی کتاب ''اظہار الحق'' (عربی) سے ماخوذ ہیں (جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے) البتہ ترجمہ ''بائبل سے قرآن تک'' سے لیا گیا ہے جو مکمل اظہار الحق کا اردو ترجمہ ہے اور مفید حواشی پر مشتمل ہے۔

انجیل متی اور انجیل مرقس کے اختلافات:

اختلاف نمبر ۱: متی نے اپنی انجیل کے باب ۲۰ میں لکھا ہے کہ:

''عیسیٰ جب یریحو سے نکلے تو راہ میں دو اندھوں کو بیٹھا ہوا دیکھا اور اُن کو اندھے پن سے شفا دی۔'' (یہ آیت ۲۹ تا ۳۴ کا مفہوم ہے)

اس کے برعکس مرقس نے اپنی انجیل کے باب ۱۰ میں ایک اندھے کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''تو تمائی کا بیٹا برمائی اندھا فقیر راہ کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔''

پھر اسے شفا دینے کا واقعہ مذکورہ ہے۔

اختلاف نمبر ۲: متی نے باب ۸ آیت ۲۸ میں لکھا ہے کہ:

''عیسیٰ علیہ السلام جب گدرینیوں کی بستی کی طرف آئے تو ان کی ملاقات دو دیوانوں سے ہوئی جو قبروں سے نکل رہے تھے' پھر مسیح نے ان کو شفا دی۔''

اس کے خلاف مرقس نے باب ۵ میں لکھا ہے کہ:

''ان سے ایک دیوانہ ملا جو قبروں سے نکل رہا تھا' پھر انہوں نے اس کو شفا دی۔'' (مرقس' باب ۵' آیت ۲)

اختلاف نمبر ۳: جو شخص انجیل متی کے باب ۹ کا مقابلہ انجیل مرقس کے باب ۵ سے کرے گا' جس میں رئیس کی بیٹی کا واقعہ مذکور ہے' تو بڑا اختلاف پائے گا۔ پہلی انجیل کا بیان ہے کہ:

''رئیس مسیح کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میری بیٹی مرگئی۔'' (متی' باب ۹' آیت ۱۸)

دوسری انجیل کہتی ہے:

''وہ آیا اور کہا کہ میری بیٹی مرنے کے قریب ہے' پھر عیسیٰ علیہ السلام اس کے ہمراہ گئے' پھر جب یہ لوگ راستہ میں تھے تو رئیس کے لوگ پہنچے اور انہوں نے

اس کے مرنے کی خبر دی۔'' (مرقس' باب ۵' آیت ۲۳)

اختلاف نمبر ۴: متی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مریم مگدلینی اور دوسری مریم (جنہیں متی' باب ۲۷' آیت ۵۶ میں یوسیس کی ماں کہا گیا ہے اور لوقا' باب ۱۶' آیت ۱ میں یعقوب کی ماں) جب قبر کے پاس پہنچیں تو خدا کا فرشتہ نازل ہوا اور پتھر قبر سے لڑھک گیا' اور وہ اس پر بیٹھ گیا' اور کہنے لگا کہ تم مت ڈرو اور جلدی چلی جاؤ۔'' (متی' باب ۲۸' آیات ۵ تا ۷) اور مرقس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں اور سلومی جب قبر کے پاس پہنچیں تو دیکھا کہ پتھر لڑھکا ہوا ہے اور جب قبر میں داخل ہوئیں تو ایک سفید پوش جوان کو قبر میں داہنی جانب بیٹھا ہوا دیکھا۔ (مرقس' باب ۱۶' آیات ۴ و ۵)

اختلاف نمبر ۵: مرقس' باب ۷ میں لکھا ہے:

''عیسیٰ علیہ السلام نے صرف ایک شخص کو اچھا کیا جو بہرا اور گونگا تھا۔''

(مرقس' باب ۷' آیات ۳۲ تا ۳۵)

انجیل متی اور انجیل لوقا کے اختلافات:

جو شخص انجیل متی میں مذکور حضرت مسیح علیہ السلام کے نسب نامہ کا مقابلہ اس بیان سے کرے گا جو لوقا کی انجیل میں ہے' تو بہت اختلاف پائے گا۔ چند اختلافات مندرجہ ذیل ہیں:

اختلاف نمبر ۱: متی' باب ۱' آیت ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام سلیمان بن داؤد کی اولاد میں سے ہیں اور لوقا' باب ۳' آیت ۳۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناتن بن داؤد کی نسل سے ہیں۔

اختلاف نمبر ۲: متی سے معلوم ہوتا ہے کہ ''شالتیل یکنیاہ'' کا بیٹا ہے' اور لوقا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیری کا بیٹا ہے۔ (متی' باب ۱' آیت ۱۲' لوقا' باب ۳' آیت ۲۷)

انجیل متی اور انجیل لوقا کے چند دوسرے اختلافات:

الف: متی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یروشلم والوں اور ہیرودیس کو آتش پرستوں کے بتانے سے پہلے ولادتِ مسیح کا علم نہیں ہوا تھا۔ (متی' باب ۲' آیات ۱ تا ۱۲) اور یہ لوگ مسیح علیہ السلام کے سخت دشمن تھے۔ (متی' باب ۲' آیت ۱۳) اس کے برعکس

لوقا کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کے والدین زچگی سے فراغت کے بعد جب قربانی کی رسم ادا کرنے یروشلم گئے تھے تو شمعون نے جو ایک نیک اور صالح شخص اور روح القدس سے لبریز تھا' اور جس کو وحی کے ذریعہ یہ بتا دیا گیا تھا کہ تیری موت مسیح کی زیارت سے پہلے نہ ہوگی' مسیح علیہ السلام کے دونوں بازو پکڑ کر ہیکل میں نمایاں کر کے ان کے اوصاف لوگوں کے سامنے بیان کئے۔ (لوقا' باب ۲' آیات ۲۵ تا ۳۲)

اسی طرح لوقا' باب ۲' آیت ۳۶ تا ۳۸ میں ہے کہ حناہ نبیہ اس وقت ربّ کی پاکی بیان کرتے ہوئے کھڑی ہوئی' اور اُن لوگوں کو جو یروشلم میں مسیح علیہ السلام کے اشتیاق انتظام میں تھے' اس نے اطلاع دی' اب اگر یروشلم کے باشندوں اور ''ہیرودیس'' کو مسیح کا دشمن مانا جائے تو ایسی حالت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ نیک بخت جو روح القدس سے لبریز تھا' ہیکل جیسے مقام پر مسیح کی خبر دیتا جہاں دشمنوں کا ہر وقت مجمع تھا؟ اور نہ ''حناہ'' پیغمبر یروشلم جیسے مقام پر لوگوں کو اس واقعہ کی اطلاع دیتی۔

فاضل ''ٹورٹن'' اگرچہ انجیل کی حمایت کرتا ہے مگر اس موقع پر اس نے دونوں بیانوں میں حقیقی اختلاف پائے جانے کا اقرار کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ متی کا بیان غلط اور لوقا کا بیان درست ہے۔

ب: متی ان دو چوروں کے بارے میں جن کو حضرت مسیح علیہ السلام کے ہمراہ (بزعم خود) سولی دی گئی' کہتے ہیں کہ:

''وہ ڈاکو بھی جو اُس کے ساتھ مصلوب ہوئے تھے' اس پر لعن طعن کرتے تھے۔'' (متی' باب ۲۷' آیت ۴۴)

لیکن لوقا' باب ۲۳' آیات ۴۰ تا ۴۳ کا بیان ہے کہ صرف ایک نے مسیح کو برا بھلا کہا' اور دوسرے نے چلا کر کہا ''اے یسوع! جب تو اپنی بادشاہی میں آئے تو مجھے یاد کرنا۔''

ج: متی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ نے جب دونوں عورتوں کو خبر دی کہ مسیح زندہ ہو گیا ہے تو وہ دونوں واپس ہوئیں' اور راستہ میں ان سے مسیح کی ملاقات ہوئی' مسیح نے ان کو سلام کیا اور کہا کہ تم جاؤ اور میرے بھائیوں کو کہہ دو کہ وہ ''گلیل''

چلے جائیں، وہاں مجھ کو دیکھ سکیں گے۔ (متی، باب ۲۸، آیات ۸ تا ۱۰)

اور لوقا کہتا ہے کہ ان عورتوں نے جب دو شخصوں سے سنا تو وہ واپس ہوئیں اور گیارہ اشخاص اور تمام شاگردوں کو اس واقعہ کی اطلاع دی، مگر انہوں نے ان عورتوں کے بیان کو سچا نہیں مانا۔ (لوقا، باب ۲۴)

انجیل متی اور انجیل یوحنا کے اختلافات:

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کب پہچانا؟

اختلاف نمبر ۱: انجیل متی کے باب ۳ میں کہا گیا ہے کہ:

''جب عیسیٰ علیہ السلام یحییٰ علیہ السلام کے پاس اصطباغ کے لئے آئے تو یحییٰ علیہ السلام نے ان کو یہ کہہ کر منع کیا کہ میں خود آپ بپتسمہ لینے کا محتاج ہوں اور آپ میرے پاس آتے ہیں؟ پھر عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے اصطباغ لیا، اور پانی میں چلے، پھر آپ پر کبوتر کی شکل میں خدا کی روح نازل ہوئی۔''

اور انجیل یوحنا کے باب ۱ میں یوں ہے کہ:

''یوحنا نے یہ گواہی دی کہ میں نے روح کو کبوتر کی طرح آسمان سے اترتے دیکھا ہے اور وہ اس پر ٹھہر گیا، اور میں تو اسے پہچانتا نہ تھا، مگر جس نے مجھ کو پانی سے بپتسمہ دینے کو بھیجا اسی نے مجھ سے کہا کہ جس پر تو روح کو اترتے، ٹھہرتے دیکھے وہی روح القدس سے بپتسمہ دینے والا ہے۔'' (یوحنا، باب ۱، آیات ۳۲، ۳۳)

اور انجیل متی کے باب ۱۱ میں یوں ہے کہ:

''اور یوحنا نے قید خانہ میں مسیح کے کاموں کا حال سن کر اپنے شاگردوں کی معرفت پچھوا بھیجا کہ آنے والا تو ہی ہے، یا ہم دوسرے کی راہ دیکھیں؟''

پہلی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام کو نزولِ روح سے پہلے جانتے تھے، اس کے برعکس دوسری عبارت یہ کہتی ہے کہ نزولِ روح سے پہلے بالکل واقف نہ تھے، بعد میں پہچانا، تیسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ روح کے بعد بھی ان کو نہیں پہچانا۔

اختلاف نمبر ۲: انجیل متی، باب ۲۶ میں ہے کہ مسیح علیہ السلام نے حواریوں

سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''تم میں سے ایک مجھے پکڑوائے گا' وہ بہت دلگیر ہوئے' اور ہر ایک اس سے کہنے لگا: اے خداوند! کیا میں ہوں؟ اس نے جواب میں کہا جس نے میرے ساتھ طباق میں ہاتھ ڈالا ہے وہی مجھے پکڑوائے گا' یہوداہ نے جواب میں کہا: اے ربی! کیا میں ہوں؟ اس نے اس سے کہا: تو نے خود کہہ دیا۔''

اس کے برعکس انجیل یوحنا' باب ۱۳ میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑوائے گا' شاگردشبہ کر کے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے' ایک دوسرے کو کہنے لگے' اس کے شاگردوں میں سے ایک شخص جس سے یسوع محبت رکھتا تھا' یسوع کے سینے کی طرف جھکا ہوا کھانا کھانے بیٹھا تھا' پس شمعون پطرس نے اس سے اشارہ کر کے کہا کہ بتا تو وہ کس کی نسبت کہتا ہے؟ اس نے اسی طرح یسوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا کہ اے خداوند وہ کون ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ جسے میں نوالہ ڈبو کر دوں گا وہی ہے' پھر اس نے نوالہ ڈبویا اور لے کر شمعون اسکریوتی کے بیٹے یہوداہ کو دے دیا۔''

اختلاف نمبر ۳: متی نے یہوداہ کے عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرانے کا حال لکھتے ہوئے باب ۲۶ میں ذکر کیا ہے کہ:

''یہوداہ نے یہودیوں کو یہ علامت بتائی تھی کہ جس کو میں بوسہ دوں اس کو تم گرفتار کر لینا' پھر اُن کے ہمراہ آیا اور عیسیٰ علیہ السلام کے آگے آ کر کہا کہ اے میرے آقا! اور ان کو بوسہ دیا' پھر یہودیوں نے مسیح کو گرفتار کر لیا۔''

(یہ آیات ۴۸ تا ۵۰ کا مفہوم ہے)

اس کے برخلاف انجیل یوحنا' باب ۱۸ میں اس طرح ہے کہ:

''پس یہوداہ سپاہیوں کی پلٹن اور سردار کاہنوں اور فریسیوں سے پیادے لے کر مشعلوں اور چراغوں اور ہتھیاروں کے ساتھ وہاں آیا' یسوع ان سب باتوں کو جو اس کے ساتھ ہونے والی تھیں' جان کر باہر نکلا اور ان سے کہنے لگا کہ کسے ڈھونڈتے ہو؟ انہوں نے اسے جواب دیا: یسوع ناصری کو' یسوع نے ان سے کہا میں ہی ہوں' اور اس کا پکڑوانے والا یہوداہ بھی ان کے ساتھ کھڑا تھا'

اس کے یہ کہتے ہی کہ میں ہی ہوں' وہ پیچھے ہٹ کر زمین پر گر پڑے۔ پس اس نے ان سے پھر پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو؟ انہوں نے کہا یسوع ناصری کو' یسوع نے جواب دیا کہ میں تم سے کہہ چکا ہوں میں ہی ہوں۔ پس اگر مجھے ڈھونڈتے ہو تو انہیں جانے دو ..... تب سپاہیوں اور ان کے صوبیدار اور یہودیوں کے پیادوں نے یسوع کو پکڑ کر باندھ لیا۔''

چاروں انجیلوں کے چند مجموعی اختلافات:

اختلاف نمبر ۱: چاروں اناجیل والے پطرس کے انکار کے سلسلے میں آٹھ لحاظ سے اختلاف کر رہے ہیں۔ (بروایت انجیل' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گرفتار ہونے سے ایک روز پہلے پطرس سے کہا تھا کہ تم مرغ کی اذان دینے سے پہلے تین مرتبہ مجھے پہچاننے سے انکار کرو گے' چنانچہ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کر لیا تو پطرس ان کے پیچھے پیچھے گئے اور تین یہودیوں نے انہیں باری باری آگ کی روشنی میں دیکھ کر کہا کہ یہ بھی ان کا ساتھی ہے' مگر پطرس نے ہر بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ساتھی ہونے اور آپ کو پہچاننے سے انکار کیا' اتنے میں مرغ بول پڑا تو انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کہی ہوئی بات یاد آئی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ نے اس اختلاف میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔)

۱۔ متی' باب ۲۶' آیات ۶ تا ۷۵ اور مرقس' باب ۱۴' آیات ۶۶ تا ۷۲ کی روایت کے مطابق پطرس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شاگرد قرار دینے والی دو لڑکیاں تھیں' اور کچھ پاس کھڑے ہوئے مرد' اور لوقا' باب ۲۲' آیات ۵۲ تا ۶۰ کی روایت کے مطابق ایک باندی اور دو مرد تھے۔

۲۔ پہلی باندی کے سوال کرتے وقت متی' باب ۲۶' آیت ۶۹ کی روایت کے مطابق ''پطرس'' مکان کے صحن میں تھا اور لوقا' باب ۲۲' آیت ۵۵ کے بیان کے مطابق مکان کے درمیان تھا' اور مرقس' باب ۱۴' آیت ۶۶ کے بیان کے موافق مکان کے نیچے کے حصہ میں' اور یوحنا' باب ۱۸' آیات ۱۶' ۱۷ کے قول کے مطابق اندر۔

۳۔ پطرس سے کیا سوال کیا گیا؟ اس میں چاروں انجیلوں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یوحنا' باب ۱۸' آیت ۱۷ میں ہے کہ ''کیا تو بھی اس شخص کے شاگردوں میں سے ہے؟'' لوقا میں ہے کہ لونڈی نے سوال نہیں کیا' اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''یہ بھی اس کے ساتھ تھا'' مرقس اور متی کا بیان ہے کہ خود پطرس سے خطاب کر کے کہا ''تو بھی یسوع گلیلی کے ساتھ تھا۔''

۴۔ مرغ کا بولنا متی' لوقا اور یوحنا کے مطابق صرف ایک مرتبہ ہوا جب کہ پطرس تین مرتبہ انکار کر چکا اور مرقس کے بیان کے مطابق تین مرتبہ' ایک دفعہ پہلے انکار کے بعد اور دو مرتبہ دوبارہ انکار کے بعد۔

۵۔ متی' باب ۲۶' آیت ۳۵ اور لوقا' باب ۲۲' آیت ۳۴ میں کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پطرس سے کہا تھا کہ تو مرغ کے بانگ دینے سے پہلے تین بار میرا انکار کرے گا اور مرقس' باب ۱۴' آیت ۳۰ میں کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ تو مرغ کے دو مرتبہ بولنے سے پہلے تین مرتبہ میرا انکار کرے گا۔

۶۔ پطرس کا جواب اس باندی کو جس نے پہلے سوال کیا تھا' متی کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ ''میں نہیں جانتا کہ تو کیا کہتی ہے'' اور یوحنا کی روایت کے مطابق صرف ''میں نہیں ہوں'' تھا' اور مرقس کی روایت کے بموجب ''میں تو نہ جانتا اور نہ سمجھتا ہوں کہ تو کیا کہتی ہے'' اور لوقا کے بیان کے موافق ''اے عورت! میں اس کو نہیں جانتا۔''

۷۔ متی کی روایت کے مطابق پطرس نے دوسرے سوال کا جواب قسم کھا کر اس طرح دیا: ''میں اس آدمی کو نہیں جانتا'' اور یوحنا کی روایت کے مطابق اس کا قول یہ تھا: ''میں نہیں ہوں'' اور مرقس کی روایت کے مطابق: فقط انکار اور لوقا کی روایت کے مطابق: ''میاں میں نہیں ہوں۔''

۸۔ کھڑے ہوئے لوگ مرقس کے بیان کے مطابق: سوال کے وقت گھر سے باہر تھے اور لوقا کے کہنے کے موافق: وہ صحن کے درمیان میں تھے۔

اختلاف نمبر ۲: پہلی تینوں انجیلوں: متی' باب ۲۷' آیت ۴۵' مرقس' باب ۱۵'

آیت :۴۳ لوقا باب ۴۴ کے عربی اور انگریزی ترجموں میں مذکور ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کوصلیب پر چڑھانے کے بعد چھ بجے سے اندھیرا چھایا رہا اور اردو ترجموں میں ان سب مقامات پر ''چھ بجے'' کے بجائے ''دوپہر کے قریب'' کے الفاظ مذکور ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام ٦ بجے کے قریب صلیب پر تھے اور انجیل یوحنا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک اس وقت پیلاطیس بنطی کے دربار میں تھے۔

اختلاف نمبر ۳: مصلوب ہوتے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پکار:

متی نے باب ۲۷ میں لکھا ہے:

''تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا:

"ایلی ایلی لما سبقتنی؟"

یعنی اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟

اور انجیل مرقس باب ۱۵ میں ہے کہ:

''الوھی ' الوھی لما سبقتنی ''جس کا ترجمہ ہے: اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟

اس کے برخلاف انجیل لوقا باب ۲۳ میں یہ الفاظ ہیں:

''اے باپ میں اپنی روح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں۔''

بائبل کی دیگر کتابوں سے چند اختلافات:

اختلاف نمبر ۱: سفر سموئیل ثانی کے باب ۲۴ آیت ۹ میں یوں ہے:

''یوآب (جو حضرت داؤد علیہ السلام کا سپہ سالار تھا) نے مردم شماری کی تعداد بادشاہ کو دی۔سو اسرائیل میں آٹھ لاکھ بہادر مرد نکلے جو شمشیر زن تھے اور ''یہودا'' کے مرد پانچ لاکھ نکلے۔''

اس کے خلاف کتاب تواریخ اوّل کے باب ۲۱ آیت ۵ میں ہے:

''یوآب نے لوگوں کے شمار کی میزان داؤد کو بتائی اور سب اسرائیلی ۱۱ لاکھ شمشیر زن مرد اور یہودا کے چار لاکھ ستر ہزار شمشیر زن مرد تھے۔''

دونوں عبارتیں بنی اسرائیل اور یہودا کی اولاد کی تعداد میں بڑا اختلاف ظاہر

کرتی ہیں۔ بنی اسرائیل کی شمار میں تین لاکھ اور یہودا کے لوگوں کی تعداد میں تیس ہزار کا تفاوت پایا جاتا ہے۔

اختلاف نمبر ۲: سفر سموئیل ثانی' باب ۲۴' آیت ۱۳ میں اس طرح ہے کہ:

''سوجاد (جادعلیہ السلام بقول توراۃ نبی تھے جنہیں غیب بین کے نام سے یاد کیا گیا ہے) نے داؤد کے پاس جا کر اس کو یہ بتایا' اور اس سے پوچھا: کیا تیرے ملک میں سات برس قحط رہے؟''

اور کتاب تواریخ اوّل کے باب ۲۱' آیت ۱۲ میں یوں ہے کہ: ''یا تو قحط کے تین برس''۔ دیکھئے پہلی عبارت میں سات سال اور دوسری میں تین سال کی مدت بتائی گئی ہے اور ان کے مفسرین نے پہلے قول کو غلط قرار دیا ہے۔

اختلاف نمبر ۳: کتاب سلاطین ثانی' باب ۸' آیت ۲۶ میں کہا گیا ہے کہ ''اخزیاہ بائیس برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا۔''

کتاب تواریخ ثانی کے باب ۲۲' آیت ۲ میں یوں ہے کہ ''اخزیاہ بیالیس برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا۔''

دیکھئے دونوں میں کس قدر اختلاف ہے! دوسرا قول یقینی طور پر غلط ہے' چنانچہ ان کے مفسرین نے اس کا اعتراف کیا ہے' اور غلط کیونکر نہ ہو' جبکہ اس کے باپ ''یہورام'' کی عمر بوقت وفات کل چالیس سال تھی' اور اخزیاہ اپنے باپ کی وفات کے بعد فوراً تخت نشین ہو گیا تھا' جیسا کہ گزشتہ باب سے معلوم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر دوسرے قول کو غلط نہ مانا جائے تو بیٹے کا اپنے باپ سے دو سال بڑا ہونا لازم آتا ہے۔

اختلاف نمبر ۴: کتاب سلاطین ثانی' باب ۲۴' آیت ۸ میں کہا گیا ہے:

''یہویاکین جب سلطنت کرنے لگا تو اٹھارہ برس کا تھا۔''

اور کتاب تواریخ ثانی کے باب ۳۶' آیت ۹ میں ہے کہ:

''یہویاکین آٹھ برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا۔''

دونوں عبارتوں میں کس قدر شدید اختلاف ہے' اور دوسری یقیناً غلط ہے' چنانچہ اس کا اقرار ان کے مفسرین نے کیا ہے۔

اختلاف نمبر ۵: کتاب خروج' باب ۹ میں ہے:

''اور خداوند نے دوسرے دن ایسا ہی کیا' اور مصریوں کے سب چوپائے مر گئے لیکن بنی اسرائیل کے چوپایوں میں سے ایک بھی نہ مرا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں کے تمام جانور مر گئے تھے' پھر اسی باب میں اس کے خلاف یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

''سو فرعون کے خادموں میں جو جو خداوند کے کلام سے ڈرتا تھا وہ اپنے نوکروں اور چوپایوں کو گھر میں بھگا لے آیا اور جنہوں نے خداوند کے کلام کا لحاظ نہ کیا انہوں نے اپنے نوکروں اور چوپایوں کو میدان میں رہنے دیا۔''

ملاحظہ کیجئے کتنا زبردست اختلاف ہے! (بشکریہ: ماہنامہ ''بینات'' کراچی)

طالبان قرآن کے لئے خوشخبری

مرکزی انجمن خدام القرآن کے شعبہ سمع و بصر کی پیشکش

☆محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** کے ٹی وی پروگرام **''حقیقت دین''** کی آڈیو سی ڈی تیار کر لی گئی ہے جس میں حقیقت ایمان' نفاق' جہاد اور منہج انقلاب نبویؐ جیسے اہم موضوعات پر تمام لیکچرز بمعہ سوال و جواب شامل کئے گئے ہیں' **(MP-3)**

☆1994ء میں امریکہ میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا بزبانِ انگریزی بیان کردہ

''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب''

اب دو آڈیو سی ڈیز میں دستیاب ہے۔ تقریباً 80 گھنٹوں پر مشتمل **(MP-3)**

قیمت فی سی ڈی : **60** روپے

ملنے کا پتہ: **مکتبہ مرکزی انجمن خدام القران لاہور**

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501 فیکس: 5834000

تعارف وتبصرۂ کتب

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : محبت رسول ﷺ

مصنف : ابوکلیم مقصود الحسن فیضی

ضخامت : 270 صفحات

قیمت : 120 روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ نور اسلام، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت رکھنا تقاضائے ایمان ہے، جس کا آغاز ایمان بالرسالت کے عقیدے سے ہو جاتا ہے۔ رسول، اللہ کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں جو انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے افضل حضرت محمد ﷺ ہیں، جن کی رسالت پر ایمان قیامت تک آنے والے انسانوں پر لازم ہے۔ رسالت پر ایمان کا لازمی نتیجہ محبت رسول ﷺ ہے۔

مؤلف نے اس کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی محبت کی حقیقت اور اس کے تقاضے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب مقدمہ کے علاوہ چھ فصول پر مشتمل ہے۔ ہر فصل جامع معلومات اور ہدایات کا خزانہ ہے، جس میں ذیلی عنوانات قائم کر کے سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے جو مستند اسلامی کتب کے حوالہ جات سے مزین ہے۔ کتاب میں محبت رسول ﷺ کے فوائد، محبت رسول ﷺ میں اضافے کے اسباب اور نبی ﷺ سے محبت کی علامات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

محبت ایک جذبے کا نام ہے، جس میں غلو کا درآنا بعید از قیاس نہیں۔ چنانچہ کتاب کی

چھٹی اور آخری فصل میں اس سلسلہ میں ہونے والی غلطیوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں کچھ ایسی بھی ہیں کہ جن سے ایمان کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے۔ یہ غلطیاں عام طور پر محبت میں غلو کے نتیجہ میں ظہور میں آتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ مخلوق میں سب سے افضل ہیں، جن، فرشتے اور تمام مخلوقات مرتبے میں حضور ﷺ سے کمتر ہیں، صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہی ہے جو بے مثل، بے مثال اور قادرِ مطلق ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی اپنی انتہائی عظمت کے باوجود عبدیت کاملہ کے مقام پر فائز تھے اور اللہ کے سامنے اپنا سر سجدہ میں رکھ دیتے تھے۔ اب رسول اللہ ﷺ کی صفت وثناء میں شاعرانہ غلو سے شرک کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے جبکہ شرک ناقابل بخشش گناہ ہے۔ لہٰذا چھٹی فصل میں غلو کے معروف انداز بتا کر خبردار کیا گیا ہے کہ محبت رسول ﷺ کے وہی انداز اختیار کئے جائیں جو حقیقی محبین یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار کئے، کیونکہ وہی انداز مستند اور محفوظ ہیں۔

کتاب دیدہ زیب ٹائٹل، خوشنما کمپوزنگ اور ٹھوس مواد کے ساتھ نور اسلام اکیڈمی کی مطبوعات میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ ''حکمت قرآن'' کے قارئین صرف ۱۰۰ روپے ارسال کر کے رجسٹرڈ ڈاک سے گھر بیٹھے حاصل کر سکتے ہیں۔

(۲)

نام کتاب : شرح شمائل ترمذی (جلد اوّل)

مصنف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ضخامت : 640 صفحات

قیمت : درج نہیں

ملنے کا پتہ : القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد نوشہرہ

مولانا عبدالقیوم حقانی علوم اسلامیہ کے نامی گرامی مصنفین میں شامل ہیں۔ آپ کم و بیش چالیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب آپ کی شاہکار تصنیف ہے جس

میں آپ کی علمی قدر و منزلت اور حسن تحقیق نمایاں ہے۔ اس میں احادیث کے متن کو اعراب سے مزین کر کے مع اسناد نقل کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی تحت اللفظ ترجمہ دیا گیا ہے۔

حدیث میں آنے والے تمام الفاظ کی تشریح ماہرانہ انداز میں کرنے کے بعد معروف علماء کی آراء بھی درج کر دی گئی ہیں۔ جہاں جہاں احادیث میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے فاضلانہ انداز میں ان کی تطبیق کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں۔ ہر حدیث کے تمام رواۃ کے نام لکھنے کے بعد ہر راوی کے مختصر سوانح، علمی عظمت و مقام اور ان کے بارے میں علماء و محدثین کے اقوال و آراء بھی نقل کئے گئے ہیں۔ کتاب ۳۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب رسول اللہ ﷺ کی سیرت و کردار کے کسی ایک پہلو کے متعلق احادیث کی تشریح پر مشتمل ہے، جس کو پڑھنے کے بعد کسی قسم کی علمی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ احادیث کی شرح بیان کرتے ہوئے مصنف کا قلم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت اور عقیدت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں امام ترمذی رحمہ اللہ کے مختصر سوانح حیات دیئے گئے ہیں جن سے امام کی قوت حافظہ، عبادت و پرہیزگاری اور علمی عظمت نمایاں ہوتی ہے۔ اس کتاب میں ہر مسلمان کے لئے جو رسول اللہ ﷺ کے مقدس و مبارک عادات و خصائل اور اندازِ نشست و برخاست معلوم کرنے کا خواہش مند ہو، طمانیت اور سکون کا سامان موجود ہے۔ شمائل ترمذی دینی مدارس کی مشہور کتاب ہے۔ ان مدارس کے طلبہ کے لئے یہ استاد کی قائم مقام ہے اور اس کتاب کا درس دینے والے اساتذہ کے لئے جامع تشریحات پر مشتمل ایک گائیڈ ہے۔

مصنف کی دوسری کتابوں کی طرح یہ اپنے موضوع پر ایک اہم اور قابل ذکر تصنیف کے علاوہ ادب اردو میں بھی ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اسلامی علوم کے مدارس و مکاتب اور سکولوں اور کالجوں کی ہر لائبریری میں یہ کتاب موجود ہونی چاہئے۔ کتاب معنوی خوبیوں کے علاوہ ظاہری طور پر بھی خوبصورت ہے اور جاذبِ نظر، حسین و جمیل ٹائٹل کے ساتھ مضبوط جلد میں محفوظ کی گئی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں ''بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر''
کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

مع

فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ
اور ہماری قومی ذمہ داریاں

☆☆☆

❁ حیات و سیرتِ اقبال ❁ فلسفہ اقبال
❁ ملت اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام

از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

☆☆☆

❁ اقبال اور قرآن ' از قلم: سید نذیر نیازی

قارئین کی سہولت کے لئے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بھی شامل کتاب کیا گیا ہے

قیمت: اشاعت خاص (سفید کاغذ' پائیدار و خوبصورت جلد) 72 روپے
اشاعت عام: (نیوز پیپر ایڈیشن) 30 روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501' فیکس: 5834000